ماہنامہ
الفاظ
رفتارِ ادب۔ معیارِ ادب

جدید ادب کا نمائندہ

ماہنامہ

الفاظ

شمارہ، مارچ ۱۹۸۴ء

اشاعت کا تیرھواں سال

مُدیر:

جمیل اختر

قیمت فی پرچہ پانچ رُوپے

ایک سال کیلئے پچپن روپے

خط و کتابت کے لئے:

پوسٹ بکس ۳۲۲۴ کراچی ۲۸

فون:

ترتیب

سرورق کی تصویر : ڈاکٹر سلیم اختر
عکاس : طارق عزیز

اپنی بات / جمیل اختر

آیئے اس بار کچھ باتیں ادبی رسائل کے بارے میں ہو جائیں۔

ویسے تو جس کو بھی دیکھئے وہ زبان سے تو علم و دانش، فکر و فن، تہذیب و ثقافت اور تخلیق و تنقید کی ضرورت اور اہمیت کے بارے میں وقت بے وقت، جگہ بے جگہ، ضرورت بلا ضرورت اظہارِ خیال کرتا مل جائے گا۔ اس میں عمر، علم، منصب اور تعلق کی کوئی قید نہیں ہے۔ سونے پہ سہاگہ یہ کہ وقتاً فوقتاً، کیسا اور کس قسم کا ادب تخلیق ہونا چاہئیے، کے بارے میں بھی مشورے اور ہدایات گوش گزار کی جاتی رہتی ہیں۔ زبانی ہمدردی اور تعاون کے دعووں کے باوجود ادب، ادیب اور ادبی رسائل کے بارے میں مجموعی رویہ تخالص سرپرستی اور عملی لاتعلقی پر مبنی ہے۔

ادبی رسائل جو عام طور پہ مدیر کے ذاتی ذوق و شوق اور انفرادی کوششوں کا نتیجہ ہیں۔ کن مسائل سے دوچار ہیں، کاغذ اور اشتہارات کے حصول کی نوعیت کیا ہے؟ ڈاک کے اخراجات میں اضافہ ادبی رسائل پر کس طرح اثر انداز ہوا ہے؟ یہ اور اسی قسم کے چند در چند معاملات پہ ہمدردی اور سنجیدگی سے توجہ اور غور و فکر بھلا کون کرے۔ ہاں گزشتہ دو چار برس میں، اکادمی ادبیات پاکستان کے زیرِ اہتمام ان مسائل کا جائزہ ضرور لیا گیا۔ اس کے بعد اشتہارات وغیرہ کے سلسلے میں جو پیش رفت ہونی چاہئیے تھی وہ تو نہ ہوئی، ہاں ۱۴ ادبی رسائل کے اشتہارات کے لئے ایک ترجیحی مراسلہ ضرور جاری ہوا۔ مگر اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ شاید کچھ نہیں؟ انفرادی طور پہ ایک دو رسائل کے مدیران باتدبیر اپنی ذاتی کوششوں سے کچھ حاصل کر سکے ہوں تو وہ اپنی جگہ، مگر عمومی طور پہ اشتہارات کی فراہمی میں کوئی قابلِ ذکر کامیابی نہیں ہوئی۔ کاغذ، اشتہار اور سرکولیشن آڈٹ کے سلسلے میں ادبی رسائل و جرائد کو تجارتی اداروں سے شائع کئے جانے والے رسالوں کے معیار اور سطح پہ پرکھا جاتا ہے۔ شاید ہمارے اربابِ حل و عقد کو یہ اندازہ نہیں کہ ادبی پرچے کا مدیر، چپراسی، دفتری، اکاؤنٹنٹ، بزنس منیجر، غرض سب کچھ خود ہی ہوتا ہے، اس کے پاس نہ تو وافر وسائل ہوتے ہیں، نہ کارکنوں کی فوج ظفر موج، محدود وسائل، اس کے رفیق اور دوست، یہی اس کا کل سرمایہ ہوتا ہے اور یہی اس کا حاصل۔ تحسینی کلمات اور ستائشی فقروں پر ہی اس کی گزر بسر ہوتی ہے۔ اس صورتِ حال میں ادبی رسائل سے جس قسم کے مطالبات کئے جاتے ہیں، بظاہر وہ کتنے ہی ضروری کیوں نہ ہوں پسندیدہ بالکل نہیں کہے جا سکتے۔ ہمیں جن ترجیحی استحقاقی رعایتوں کی طرف توجہ دلانی ہے وہ یوں ہیں:

ادبی رسائل اور جرائد کو اے بی سی سے مستثنیٰ قرار دیا جائے اور اشتہارات کے مروجہ / موجودہ نرخ برقرار رکھے جائیں۔ جو ادبی رسائل اور جرائد اشتہارات کے نرخ میں اضافہ کے خواہش مند ہوں وہ اپنے سرکولیشن کا آڈٹ کرا سکتے ہیں۔

ادبی رسائل کے نیوز پرنٹ کا کوٹہ حسبِ ضرورت مقرر کیا جائے۔

سرکاری صنعتی اداروں کو اس بات کی خصوصی ہدایت جاری کی جائے کہ وہ اکادمی ادبیات پاکستان کی سفارش پر جاری کردہ فہرست میں مندرج رسائل اور جرائد کو سال میں کم از کم ۶ اشتہار ضرور جاری کریں۔

اکادمی ادبیاتِ پاکستان ہر ادبی رسالے کی کم از کم ۵۰۰ کاپیاں ہر ماہ خرید کر تعلیمی، علمی اور ثقافتی اداروں کو جاری کرے۔

یہ اور اسی قسم کے بہت سے مسائل فوری توجہ اور ہمدردانہ پیش رفت کے مستحق ہیں۔ ہمیں یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ ان مسائل کے بارے میں پہلی بار اکادمی ادبیاتِ پاکستان کے حوالے سے سنجیدگی اور ہمدردی سے غور کیا گیا اور کچھ سرگرمی آئی، ہم ان سطور کے ذریعے ایک بار پھر اکادمی ادبیات کے فعّال اور سرگرم ڈائرکٹر جنرل پروفیسر سمیع الدین احمد صدیقی اور اردو کے مایۂ ناز ادیب اور اداروں کے چیرمین جناب شفیق الرحمٰن سے استعانت کے طلبگار ہیں۔ ہماری خواہش ہے کہ وہ جلد از جلد ادبی رسائل کے مدیروں کی ایک میٹنگ اپنی سربراہی میں اسلام آباد میں طلب فرمائیں اور ان تمام مسائل کے بارے میں ایک مشترکہ لائحہ عمل تیار کرکے اس پر جلد از جلد عمل در آمد بھی کرائیں۔

گزشتہ دنوں معاصر "سیپ" کا ایک شمارہ بھی پریس اینڈ پبلیکیشن آرڈی نینس کی زد میں آیا۔ اس ضمن میں کہنے کو بہت کچھ ہے اور ادب میں فحاشی کے مسئلے پر گفتگو کے بڑے امکانات ہیں، ہم بھی کچھ عرض کرنا چاہتے تھے مگر معاصر "تخلیق" کی مدیرہ محترمہ عذرا اصغر نے اس مسئلے پر بات کرتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے اُس میں بڑی سچائی ہے۔ اس مسئلے پر خود کچھ لکھنے کے بجائے ہم "تخلیق" کا اداریہ نقل کر رہے ہیں:

"ان دنوں ہر دوسرے تیسرے یہ خبریں چھپ رہی ہیں کہ فلاں پرچے کو فحش تحریریں چھاپنے کے الزام میں ضبط کر لیا گیا ہے۔ ان میں سے ایک ادبی رسالہ "سیپ" ہے اور باقی کے ڈائجسٹ پرچے ہیں۔ ہم ڈائجسٹ پرچوں کی وکالت نہیں کرنا چاہتے کہ ان کا مزاج اور معیار ہی الگ ہے۔ یہ ایک لمبی اور پرانی بحث ہے کہ ڈائجسٹ پرچوں نے اردو زبان و ادب کی کتنی خدمت سرانجام دی ہے؟ ہم ان کی مخالفت کرنا چاہتے ہیں نہ کوئی خاص وضاحت۔ لیکن ایک بات کا اعتراف ضرور کریں گے کہ ان میں سے چند ایک ڈائجسٹ پرچے واقعی سنجیدگی اور وقار کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ اس وقت ہمارے پیشِ نظر ادبی رسالے کی ضبطی کا معاملہ ہے۔

فحاشی کیا ہے اور کونسی تحریریں فحش ادب کے ذیل میں آتی ہیں، صدیوں سے اس کا کوئی فیصلہ نہیں ہو سکا۔ یورپ اور امریکہ کے آزاد معاشروں میں بھی کئی بار یہ مسئلہ اُٹھا ہے۔ ہمارے برصغیر میں اس سلسلے میں جو ادیب متنازعہ بنے اُن میں عصمت چغتائی اور خصوصیت سے سعادت حسن منٹو زیادہ نمایاں رہے۔ منٹو نے ان الزامات کی تکرار سے تنگ آکر ایک بار لکھا تھا "مجھے فحش نگار کہنے والے یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ میں تین بیٹیوں کا باپ ہوں!" (خیال رہے کہ یہ سطریں لکھنے والی بھی ایک عورت ہے) منٹو پر فحش نگاری کے الزام میں جو مقدمے چلے اُن سے کئی دلچسپ باتیں سامنے آئیں۔ ان کے ایک مقدمے میں عابد علی عابد، صوفی تبسم، فیض، عبدالرحمٰن چغتائی، تاثیر اور کئی دوسرے نامور لوگ گواہان کی حیثیت سے حاضر ہوئے اور اس موضوع پر کھل کر دلائل دیئے۔ ایسے ہی ایک مقدمے کے ایک گواہ (جو ہندو تھا) نے ایک سوال کے جواب میں منٹو پر فحاشی کا الزام لگاتے ہوئے کہا کہ ان کی

تحریر میں "یار" کا لفظ استعمال ہوا ہے، جو فحش ہے۔

بات دُور نکل جائے گی، ہمیں دو ٹوک کچھ باتیں کرنا ہیں۔ کیا صاحبانِ اختیار بتائیں گے کہ کسی کتاب یا رسالے پر فحاشی کا الزام عائد کر کے اُسے ضبط کرنے والے کی علمی استعداد کیا ہے؟ کیا وہ زبان و ادب کی نزاکتوں، اظہار کی باریکیوں اور اسلوب کی لطافتوں سے بہرہ ور ہونے کی استطاعت رکھتا ہے؟ ہمارا تجربہ یہ ہے کہ ایسے لوگ سیدھے سادے دفتری ہوتے ہیں جن پر اہلِ بصیرت تنگ نظر ہونے کا الزام بھی لگا سکتے ہیں۔

کوئی بھی ادبی رسالہ جو تحریر چھاپتا ہے، اس رسالے کا مدیر ہر پہلو سے اُس کا جائزہ لیتا ہے اور پھر اُسے اپنے ہزاروں قارئین کے سپرد کرتا ہے۔ وہ رسالے سے اتنا ہی متعلق ہوتا ہے، جتنا اپنی اولاد سے۔ کیا اسے اپنے نام و نمود اور وضعداری و نجابت کا پاس نہیں ہوتا۔ کیا اُسے اچھے اور بُرے کا احساس نہیں ہوتا؟ ہمیں یقین ہے کہ ہوتا ہے۔ اسی لئے وہ پوری احتیاط اور ذمہ داری سے رسالہ شائع کرتا ہے۔

یادش بخیر، ایک انجمن ادبی رسائل بھی ہے۔ جس کی عہدیدار نہایت معتبر اور باوقار شخصیات ہیں۔ ایک رائٹرز گلڈ ہے اور ایک اکیڈمی آف لیٹرز بھی ہے۔ ان تمام محترم اداروں میں سے کسی ایک نے بھی ایک ادبی رسالے کے ایک شمارے کی ضبطی پر توجہ نہیں فرمائی۔ کیا یہ معاملہ ادب اور ادیب کا نہیں؟ اگر ہے (اور یقیناً ہے) تو پھر یہ ادارے منقار زیرِ پَر کیوں ہیں؟ انھیں اپنا مثبت کردار ضرور ادا کرنا چاہیے۔ اس کے علاوہ اس قسم کے ناپسندیدہ عمل کو مستقبل میں روکنے کے لئے، ہمارا خیال ہے کہ رسالے یا کتاب پر فحاشی کا الزام عائد کرنے والے متعلقہ حضرات کو ایک طریقۂ کار مرتب کرنا چاہیے۔ یا تو وہ رسالے کے مُدیر سے مہذب انداز میں جواب طلبی کریں یا ان اداروں سے رجوع کریں یا پھر اہلِ علم اور صاحبِ نظر لوگوں کی کمیٹی تشکیل دیں، جو اس نوع کے اہم فیصلے کر سکے۔ ہمیں امید ہے کہ انجمن ادبی رسائل، رائٹرز گلڈ اور اکیڈمی آف لیٹرز جیسے ادارے بھی اپنی ذمہ داری کو محسوس کریں گے اور پابندی لگانے والے صاحبان بھی اپنے طریقۂ کار اور فیصلے پر نظرِ ثانی کریں گے۔ ●

ابھی کلیم الدین احمد کو ہم سے جُدا ہوئے زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ قاضی عبدالودود بھی رخصت ہو گئے۔ ہمارا قاضی صاحب سے ایک ذاتی رشتۂ نیازمندی بھی تھا، اور اُن کی موت نے جہاں ادبی تحقیق سے ایک بہت بڑا حوالہ چھین لیا وہاں ہم سے ایک شفیق بزرگ بھی۔ میں اردو تحقیق میں ان کا شمار چند بڑوں میں کرتا ہوں۔ محمود شیرانی، امتیاز علی عرشی، قاضی عبدالودود، مسعود حسن رضوی، ڈاکٹر نذیر احمد، مالک رام اور رشید حسن خاں۔ ان میں سے اول چار ہم سے جُدا ہو چکے ہیں، بقیہ کو اللہ سلامت رکھے۔ یہ چار اپنا اعلیٰ تحقیقی معیار ہمیشہ قائم رکھتے تھے، تاریخی تحقیق، تحقیقی متن اور تدوین کے جو مثالی نمونے ان حضرات نے پیش کئے وہ ہماری علمی تاریخ کا گراں قدر سرمایہ ہیں۔

قاضی صاحب تحقیق کو حقیقت کی تلاش جانتے اور مانتے تھے اور انھیں شخصیت پرستی اور روایت پروری سے ہمیشہ گریز رہا۔ بُت شکنی میں انھیں بڑا لطف آتا تھا۔ مسلّمات سے انحراف ان کی تحقیق کا جزوِ خاص تھا۔ مگر اس عمل میں وہ اپنے ذاتی تعصبات اور ترجیحات کو پیشِ نظر رکھنے کے قائل نہ تھے۔ اس میں نہ قیدِ مقام کا گزر تھا نہ ذاتی اور شخصی تعلق کا۔ مغرب سے انھوں نے علمی تحقیق کا فن سیکھا تھا اور اس فن کو اردو کی علمی اور ادبی تاریخ کا ایک معتبر حوالہ بنا دیا۔ وہ تحقیق میں معروضیت کے قائل تھے۔ ایسی معروضیت جسے صرف حقائق سے سروکار ہو، افسانہ و افسوں سے نہیں۔ زندگی بھر وہ اپنے اسی مشن پر گامزن رہے۔

(بڑے بڑوں کو ناخوش کر کے بھی) ۔

ان کے تحقیقی سفر کی ابتدا "معیار" اور معاصر" پٹنہ سے ہوئی اور "تحقیق" اور ' خدابخش اورینٹل جرنل" پر ختم ۔ اس دوران میں انھوں نے ہزاروں صفحات لکھے ۔ دو مختصر مجموعے " عیارستان" اور " انشتر و سوزن" کے نام سے شائع ہوئے جسنا تھا پروفیسر کلیم الدین احمد نے اُن کے بکھرے ہوئے مقالات کئی جلدوں میں مرتب کئے تھے مگر وہ شاید ابھی تک طبع نہ ہو پائے ۔ میرے خیال میں اب یہ اہم کام خدابخش اورینٹل جرنل کے ایڈیٹر اور خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری کے ڈائرکٹر ڈاکٹر عابد رضا بیدار کو سرانجام دینا چاہیئے ۔ وہ نہ صرف خود ایک ممتاز عالم اور محقق ہیں بلکہ قاضی صاحب کے کام سے بخوبی واقف اور معترف بھی' اور ان کے ارادت مند بھی ۔ وہ یہ کام کریں گے اور خوب کریں گے ۔ ان مقالات کی اشاعت ہماری ادبی تاریخ کے ایک مستند ماخذ اور حوالہ کی حیثیت سے ہمیشہ یادگار رہے گی ۔ قاضی صاحب "جہانِ غالب" کے عنوان سے ایک قاموسی کام کر رہے تھے' اس کی ترتیب و تدوین اور اشاعت بھی ضروری ہے ۔ مجھے یقین ہے کہ خدابخش کے اربابِ حل و عقد قاضی صاحب کی روایات کے مطابق یہ کام سرانجام دیں گے ۔

قاضی صاحب نے اردو تحقیق میں سائنسی نثر لکھنے کا انداز بھی رائج کیا ۔ وہ صنعات کے استعمال میں خاصے محتاط تھے ۔ محتاط کیا جُز رس تھے ۔ ان کی تحریر پڑھنے کو کلیجہ چاہیئے ۔ کیونکہ بعض اوقات وہ ریاضیاتی فارمولوں کی شکل اختیار کر جاتی ہے ۔ اختصار اور ایجاز بعض اوقات اُن کے یہاں ذہنی آزمائش کی صورت اختیار کر لیتے ہیں ۔ اُن کی تحقیق ایک تربیت یافتہ ذہن کی طلب گار ہے ۔ یہ سب اور بہت کچھ صرف قاضی صاحب کی ذات تک محدود تھا ۔ ان جیسا شخص اب کوئی اور نہیں ہے اور نہ علمی کساد بازاری کے اس دور میں اس کی توقع کی جا سکتی ہے ۔ جہاں لکھنے سے پہلے چھپنے کا چسکا ہو ۔ خدا کرے ہم میں سے کوئی اُن کی تحقیقی روایت کا سچا پیرو کار سامنے آسکے ۔

موجودہ شمارہ عہدِ جدید کے معروف افسانہ نگار اور ناقد ڈاکٹر سلیم اختر کے لئے مخصوص ہے ۔ گزشتہ رُبع صدی سے وہ تخلیق و تنقید کے میدان میں اپنے جوہر دکھا رہے ہیں ۔ رومانوی افسانہ نگاری سے لے کر نفسیاتی اور جنسی مسائل تک' اور ادبی تنقید سے مطالعاتی تنقید تک اُن کے فکر و فن کی زد میں ہیں ۔ وہ متنازعہ مسائل پر جی کھول کر بلا رُو رعایت لکھتے ہیں ۔ اُن کے قلم کی تیزی اور تحریر کی روانی کے ہم بھی قائل ہیں ۔ اُڑتی سی خبر ہے کہ وہ مارچ میں پچاس برس کے ہو رہے ہیں' یہ خصوصی پیش کش اُن کی پچاسویں سالگرہ پر ہمارا نذرانہ ہے ۔ نذرانۂ رفاقت ۔

میرزا ادیب

ڈاکٹر سلیم اختر، میری نظر میں

ڈاکٹر سلیم اختر ــ مگر میرے لئے صرف سلیم اختر اور یہ اس وجہ سے نہیں کہ میں اُس سے بڑا ہوں، اور شانِ بزرگی کا تقاضا ہے کہ چھوٹے کے نام کو مخفف کر لیا جائے، اور نہ اس بنا پر کہ میں کوئی بڑا "سینئر" ادیب ہوں، بلکہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ مجھے سلیم اختر سے محبت اور پیار ہے۔ میں جب ڈاکٹر سلیم اختر کا نام لیتا ہوں تو لگتا ہے کہ ایک پختہ پوش شخصیت میرے سامنے آگئی ہے۔ حالانکہ میری مراد اس شخص سے ہوتی ہے جو میرے دل کے بہت قریب ہے۔ ایسے بہت قریب رہنے والے شخص سے کسی قسم کا تکلف روا نہیں رکھا جا سکتا۔ میں یہاں یہ عرض کر دوں کہ ایسا معاملہ فقط سلیم اختر کے ساتھ ہے اَوروں کے ساتھ نہیں۔ دوسرا کوئی ڈاکٹر ہے تو میں اُسے ڈاکٹر کہنا روا سمجھوں گا مگر سلیم اختر کو نہیں۔ اب یہ الگ بات ہے کہ کبھی کبھی مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ میں اُس کی بے پناہ ذہانت سے متاثر ہی نہیں مرعوب بھی ہوں، اور اس اعتراف کے باوجود میں اُسے وہی کچھ سمجھتا ہوں جو اب تک سمجھتا رہا ہوں اور سمجھتا ہوں۔

سلیم اختر کی ذہانت کا ذکر آیا ہے تو مجھے سلیم اختر کی یہ ایک عجیب خصوصیت معلوم ہوتی ہے کہ ذہین سے ذہین آدمی کی ذہانت بھی عمر کے ساتھ ساتھ کم ہوتی چلی جاتی ہے مگر سلیم اختر کے معاملے میں مجھے یہ احساس ہوتا ہے کہ اُس کی ذہانت دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی کرتی جا رہی ہے۔ اُس کے بالوں کی بڑھتی ہوئی سفیدی اُس کے بڑھاپے کی علامت نہیں بلکہ اُس کی روز افزوں ذہانت کی چمک دمک کا اظہار کرتی ہے۔

پچھلے دنوں ایک صاحب نے سلیم اختر پر مضمون لکھا تھا۔ اس کا ایک فقرہ بڑا پسند کیا گیا تھا، اور وہ فقرہ ہے کہ سلیم اختر ہر جگہ پہنچ جاتا ہے اور جہاں خود نہیں پہنچ پاتا وہاں اُس کی سائیکل پہنچ جاتی ہے۔

فقرہ خوبصورت ہے لیکن مجھے اس کی سچائی میں کلام ہے۔ سلیم اختر اور اُس کی سائیکل ــــ یہ دونوں ایک دوسرے کے سچے ساتھی اور وفادار ہیں۔ دونوں ہمیشہ ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔ اُس کی سائیکل کی وفاداری یہ ہے کہ اس نے آج تک اپنے ساتھی سے ایسا رویہ اختیار نہیں کیا کہ وہ کسی حادثے کا شکار ہو جائے، ادھر سلیم اختر اُس کا اتنا خیال رکھتا ہے کہ باوجود اس امر کے کہ یہ بے چاری عمر رسیدہ ہو چکی ہے اسے پہلی سی محبت ہی دیتا ہے اور اس سے پہلی سی محبت ہی مانگتا ہے۔ آپ نے یہ خبر سنی ہو گی کہ کسی کمپنی نے تین پُرانے سائیکل سوار ادیبوں کو تحفۃً تین نئی سائیکلیں دی تھیں۔ میرا خیال تھا کہ سلیم اختر کو جو نئی سائیکل ملی ہے اب وہ ان کا ساتھ دے رہی ہو گی ــــ مگر یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اُس کے ساتھ اُس کی وہی بوڑھی سائیکل ہم قدم ہے۔

میں نے یہ سوال کرنا مناسب نہ سمجھا کہ حضرت! وہ نئی نویلی سائیکل کا کیا ہوا۔ میرا اپنا اندازہ یہ ہے کہ نئی نویلی سائیکل اُس کے بیٹے

کے حصّے میں آئے گی اور اطاعت شعار بیٹا اسے باپ کا ورثہ سمجھ کر آنکھوں سے لگائے گا اور اس کے ساتھ وہی سلوک کرے گا جو اُس کے پدرِ بزرگوار نے اپنی بزرگ سائیکل کے ساتھ کیا ہے اور کر رہا ہے ۔

یہ واقعہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ ایک مرتبہ سلیم اختر نے سائیکل چھوڑ کر موٹر سائیکل سے بھی یاری گانٹھ لی تھی ۔ مگر اس کی سائیکل اپنی سوتن برداشت نہ کر سکی ۔ بہت افسردہ اور مغموم ہو کر کمرے کی ایک دیوار سے جا لگی ۔ سلیم اختر اس کی حالت زار سے اس درجہ متاثر ہوا کہ چند روز بعد ہی موٹر سائیکل کو رخصت کیا اور پھر اپنی پُرانی رفیقہ سے تجدیدِ تعلقات پر آمادہ ہوگیا ۔ دونوں پھر ایک دوسرے کے رفیقانِ صادق بن گئے ۔

ایک بار مجھے جو شرارت سوجھی تو سعیدہ بھابی سے کہا :

" بھابی ! آپ اپنے شوہر نامدار کو منع کیوں نہیں کرتیں ۔ پُرانی سائیکل گھسیٹے پھرتے ہیں "

میرا تیر نشانے پر بیٹھا ، بولیں :

" میں تو کئی بار کہہ چکی ہوں کہ اس نگوڑی سائیکل کا پیچھا چھوڑ دیں ــــ مانتے ہی نہیں "

میں نے انھیں مزید آزمائش میں ڈالنے کے ارادے سے کہا :

" بھابی ! اصل میں آپ کے میاں کو اپنی سائیکل سے بڑی محبت ہے "

فوراً بول اٹھیں :

" محبت وحبت نہیں ہے ــــ ذرا کنجوس ہیں ــــ بس ۔ میرا تو جی چاہتا ہے کہ اس سائیکل کو باہر پھینک دوں "

میں نے سمجھ لیا کہ بھابی کا جذبۂ رقابت جوش میں آ گیا ہے ، موضوعِ گفتگو بدل دیا ۔

سعیدہ بھابی ، جہاں تک میں انھیں سمجھ سکا ہوں " دو " اور " دو " چار قسم کی حقیقت پسند واقع ہوئی ہیں ــــ سلیم اختر ایک تخلیقی قلم کار ہے ۔ حقیقت پسند ہونے کے باوصف کبھی کبھی خواب بھی دیکھ لیتا ہے ــــ خوابوں میں کھو بھی جاتا ہے ، مگر میری یہ بھابی ــــ کبھی خواب نہیں دیکھتیں ۔ ہر حقیقت کو حقیقت کے رُوپ ہی میں دیکھنے کی عادی ہیں ۔ بڑے بڑے منصوبے بھی نہیں بناتیں ۔

جن دنوں سلیم اختر اپنے چھوٹے سے کنبے کے ساتھ میرے قریب رہتا تھا تو سعیدہ بھابی سے میری اکثر گفتگو ... رہتی تھی ۔ ایک روز اُن سے مستقبل کے بارے میں بات ہو رہی تھی ۔ میں نے پوچھا :

" بھابی ! مستقبل کے متعلق کیا سوچا ہے ؟ "

سعیدہ بھابی اُس پان خور تیز زبان مخلوقِ خدا میں شامل ہیں ، جو بولنے پر آتی ہے تو بولتی ہی چلی جاتی ہے ۔ میرا سوال سُن کر کہنے لگیں ۔

" سلیم صاحب کی اتنی عمر ہو چکی ہے ۔ ہم دونوں کما رہے ہیں مگر مکان جلدی نہیں بنوا سکتے ۔ اس عمر میں سلیم شاید مکان بنوانے کے قابل ہو جائیں ــــ اس عمر میں ریٹائر ہو جائیں گے ــــ اس عمر میں کانی بوڑھے ہو جائیں گے ــــ "

میں دل میں ڈرا کہ اب وہ کہیں یہ نہ کہہ دیں ، اس عمر میں انتقال فرما جائیں گے ــــ جلدی سے کوئی اور ذکر چھیڑ دیا ۔

سلیم اختر کو دوسروں سے تعلقات قائم کرنے کا بڑا اچھا ڈھنگ آتا ہے ۔ اجنبی سے اجنبی شخص کو بھی اپنا لیتا ہے ۔ ایک دن سُنتے ہیں کہ ہندوستان سے فلاں ادیب لاہور میں آیا ہے ، دوسرے روز اس کی تصویر چھپے گی تو اس کے پہلو میں آپ سلیم اختر کو ضرور موجود پائیں گے ۔ دو تین بار وہ میری موجودگی ہی میں ایسے لوگوں سے ملا جن سے میری اور اس کی پہلی ملاقات ہو رہی تھی ــــ میں اپنا نام بتانے میں ہچکچاتا رہا مگر سلیم اختر نے فوراً آگے بڑھ کر کہا :

"میرا نام سلیم اختر ہے ـــ آپ نے مجھے ضرور پڑھا ہوگا۔"

کوئی شخص اتنا تو بد لحاظ نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنے ملاقاتی سے یہ کہہ دے، نہیں جناب! میں نے آپ کو نہیں پڑھا۔ ضرور کہہ دیتا ہے، جی ہاں آپ کو پڑھا ہے، ماشاء اللہ خوب لکھتے ہیں۔

مجھے سچ مچ رشک آتا ہے سلیم اختر کی دوست آفرینی پر۔ بیرونِ ملک سے میرے نام آشنا لوگ آتے ہیں اور مجھ سے ملے بغیر چلے جاتے ہیں ـــ مگر تقریبات میں سلیم اختر کے بارے میں ضرور پوچھتے ہیں کہ کیسے ہیں ـــ کیا کر رہے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ نہ جانے سلیم اختر میں ایسی کونسی خوبی ہے کہ اپنے پرائے سب اس سے متاثر ہوئے بغیر رہ ہی نہیں سکتے۔

عام طور پر ہمیں کوئی تخلیقی کام کرنا ہو تو کوئی گوشۂ عزلت ڈھونڈتے ہیں، جہاں بیٹھ کر خیالات مجتمع کر کے کچھ لکھ سکیں۔ جس زمانے میں "صحرا نورد کے خطوط" لکھے گئے تھے، میں سکون کی خاطر شاہی قلعے کی عقبی سیڑھیوں کے اوپر جا کر دو تین گھنٹے بیٹھ کر لکھا کرتا تھا ـــ مگر میں نے دو شخص ایسے دیکھے ہیں جو تحریری کام کے لئے کسی قسم کا بھی اہتمام نہیں کرتے۔ ان میں ایک تو سعادت حسن منٹو مرحوم تھے، جو "سویرا" کے دفتر میں آتے تھے۔ الماری میں سے پیڈ نکالتے تھے، جیب سے پنسل برآمد کر کے اس کے سکّے کو ذرا باریک کر لیتے تھے اور لکھنا شروع کر دیتے تھے ـــ گاہک آتے تھے، ملنے والے لوگ آتے تھے، سڑک پر ہر وقت شور رہتا تھا مگر منٹو اوپر سر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے تھے۔ کہانی جب تک مکمل نہیں ہو جاتی تھی کوئی خارجی عنصر اُن کے کام میں مداخلت نہیں کر سکتا تھا۔ قریب قریب یہی حالت میں نے سلیم اختر کی بھی دیکھی ہے ـــ میرے قریب رہتا تھا تو میں دیکھتا تھا کہ مہمان آ جا رہے ہیں اور یہ ہے کہ اپنے کام میں مصروف ہے۔ اور ایک روز تو کمال ہو گیا۔ سلیم اختر ٹمبل روڈ پہ ایک چھوٹے سے مکان میں رہتا تھا۔ میں ملنے کے لئے گیا تو اندر بلا لیا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ بھابی سعیدہ روٹیاں پکا رہی ہیں اور ہمسایوں سے نان اسٹاپ باتیں بھی کرتی جاتی ہیں۔ تینوں بچے اپنے اپنے شغل میں مصروف ہیں۔ دو مہمان چارپائی پر بیٹھے کھانا کھا رہے ہیں، اور سلیم اختر وہیں ایک کرسی پر بیٹھا بڑے مزے سے لکھ رہا ہے۔ اس شخص کو اپنے اعصاب پر حد درجہ قابو ہے۔

مجھے سلیم اختر کو بڑے قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ میں نے اسے ایک فرض شناس شوہر، بچوں سے بڑی محبت کرنے والا باپ، امن پسند ہمسایہ اور بہت اچھا دوست پایا ہے۔ مگر ایک بات کہے بغیر نہیں رہ سکتا۔ آپ اس کے کتنے ہی اچھے دوست کیوں نہ ہوں۔ عموماً آپ کے کام نہیں آئے گا۔ یہ نہیں کہ کوئی بہانہ کر دے یا آپ کو کسی شائستہ طریقے سے ٹال دے ـــ نہیں ـــ منافقت تو اس کی زندگی میں آئی ہی نہیں ـــ آپ کو صاف جواب دیدے گا کہ میں یہ کام نہیں کروں گا۔ آپ تلملا کر رہ جائیں، اُسے کیا۔

ایک بار میرے اور اُس کے مشترکہ دوست نے اُس سے کہا۔

"فلاں پرچہ آپ کے پاس ہے، یہ رول نمبر ہے اور یہ نشانی ہے۔ خاص توجہ کیجئے۔"

کہنے والے کو بڑی توقع تھی کہ سلیم اختر فوراً حامی بھر لے گا۔ مگر وہ کہنے لگا۔

"یہ پرچہ میرے پاس نہیں ہے ـــ فلاں صاحب کے پاس ہے۔"

"تو فلاں صاحب سے کہہ دیں۔"

"وہ مانیں گے یا نہیں مانیں گے۔ کیا کہا جا سکتا ہے ـــ اللہ پر بھروسہ کیجئے۔"

اسی طرح مجھے اپنے بیٹے کو گورنمنٹ کالج میں داخل کرانا تھا۔ سلیم اختر سے کہا کوشش کریں۔ اسے داخل کرانے کی ڈیوٹی آپ کی ہے۔" کہنے لگا۔ اس معاملے میں میری کون سنتا ہے معمولی سا لیکچرار ہوں ـــ خواہ مخواہ کوفت ہوگی ـــ داخل ہو جائے گا۔ لائق فائق باپ کا بیٹا ہے ـــ یہ جواب سُن کر میں جل اُٹھا۔ بولا ـــ سلیم یار! اپنا کام ہو تو آپ زمین کے گز بن جاتے ہیں، میرے کام کے لئے دو چار پھیروں سے بھی نہیں

مل سکتے — یہ خود غرضی ہے!" سلیم اختر کے منہ پر تلخ سے تلخ بات کہہ دیں خفا نہیں ہوگا۔ اس وقت بھی خفا نہیں ہوا۔ میرا ہاتھ پکڑ کر کینٹین میں لے گیا۔

سلیم اختر کے متعلق میرا ایک اور تجربہ بھی ہے۔ وہ کتنی بھی خوشگوار امید دلائے، اعتبار نہ کیجئے ورنہ پچھتانا پڑے گا۔ جس زمانے میں گورنمنٹ کالج ملتان میں لیکچرار تھا تو جب بھی لاہور آتا مجھ سے ضرور کہتا تھا:

"ملتان آیئے، عیش کرا دوں گا"

سوچتا تھا، یا اللہ یہ مجھے کیا عیش کرائے گا۔ بڑے سہانے خواب دیکھا کرتا تھا۔ ایک بار ایسا ہوا کہ رائٹرز گلڈ کی ملتان شاخ کا انتخاب کرانا تھا۔ سیکرٹری جنرل نے یہ ذمہ داری مجھ پر ڈال دی۔ بہت خوش ہو گیا۔ سلیم اختر کو خط لکھ دیا۔ آرہا ہوں ایسا عیش کرائیے کہ چشمِ فلک نے نہ دیکھا ہو۔

سہانے خوابوں کی فضا میں پرواز کناں ملتان پہنچ گیا۔ اپنی ذمہ داری نبھانے کے بعد سلیم اختر سے ملاقات کی۔ سلیم اختر نے جو مجھے عیش کرایا وہ یہ تھا:

ایک معمولی ہوٹل میں چائے کی ایک پیالی اور دو تین بسکٹ۔ آٹھ آنے کی کھجوریں خریدی گئیں جو ہم دونوں نے مل کر کھائیں اور شام کے وقت دوسرے درجے کی کلاس میں بیٹھ کر ایک فلم دیکھی۔ ساری رقم زیادہ سے زیادہ پونے چار روپے بنی۔

کیسا شاندار عیش کرایا تھا سلیم اختر نے! امید ہے میرے اور سلیم اختر کے مشترکہ احباب اس واقعے سے عبرت حاصل کریں گے۔ سیدہ بھابی نے کہا تھا سلیم صاحب کنجوس ہیں —— میں کہتا ہوں مہا کنجوس ہے۔ ایک بار چائے پلا دے گا تو چار بار اس کا ذکر کرے گا۔ مگر اس کی یہ کنجوسی یک طرفہ نہیں ہے۔ اپنے احباب کو بھی کبھی زحمت نہیں دیتا۔ میرے یہاں آتا ہے تو ذرہ برابر تکلف کرنے کی اجازت نہیں دیتا — صرف ایک کپ چائے پئے گا اور یہ بھی اصرار کے بعد۔

یہ بہت مختصر خاکہ غیر مکمل رہے گا جب تک اس کی املا کا ذکر نہ کیا جائے۔ سلیم اختر خود خوبصورت اور مناسب و موزوں خد و خال کا مالک ہے۔ اسے وجیہہ آدمی کہا جا سکتا ہے لیکن اس کی املا — لگتا ہے ہزاروں کی تعداد میں چیونٹیوں کو مار کر کاغذ پر بکھیر دیا گیا ہے۔ ایسا بدخط شخص میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ اگرچہ اس خوبی میں میں بھی پانچوں سواروں میں ہوں مگر سلیم اختر کا تو جواب نہیں — کاتب اس کی املا سے بہت گھبراتے ہیں لیکن بیچاروں کو لکھنا پڑتا ہے۔ کیونکہ سلیم اختر بے تحاشا لکھتا رہتا ہے اور ایڈیٹروں کو اپنے مضامین بھجتا رہتا ہے۔

آج کل سلیم اختر کی ایک اور خوبی کا بڑا شہرہ ہے اور یہ خوبی ہے اس کی چھیڑ خانی۔ فقرہ تراشی میں ڈاکٹر وحید قریشی، عطاء الحق قاسمی اور امجد اسلام امجد کا بڑا نام ہے لیکن سلیم اختر، لگتا ہے اگر یہی کیل و نہار رہے تو ان سے شاید آگے نکل جائے گا۔

اس کی چھیڑ خانی مجھے پسند نہیں —— مگر اپنے پچھلے دوستانہ تجربات کی روشنی میں کہہ سکتا ہوں کہ سلیم اختر کبھی پہل نہیں کرتا — کبھی خود زیادتی نہیں کرتا — کوئی اس پر زیادتی کرے تو پھر یہ اسے بخشنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ ویسے وہ دوستوں کا دوست ہے بلکہ بہت اچھا دوست ہے۔

سلیم اختر کو ماہرِ جنسیات کہا جاتا ہے۔ جنسی موضوعات پر اس نے بہت کچھ لکھا ہے — وہ ماہرِ جنسیات ہے مگر علم کی حد تک۔ آج تک کسی نے اس کا کوئی اسکینڈل نہیں سنا۔ یہی وجہ ہے کہ صنفِ نازک کی نو واردانِ ادب اس سے بالکل نہیں گھبراتیں بلکہ دوسروں سے زیادہ اس کی طرف متوجہ ہوتی ہیں۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں سلیم اختر نے حقیقی محبت صرف ایک لڑکی سے کی ہے جو آج اس کی گھر والی اور اس کے تین خوبصورت بچوں کی ماں ہے۔

مسعود اشعر

بکری، دودھ اور مینگنیاں

سلیم اختر ملتان کی جس گلی میں رہتے تھے اس گلی میں ان کے دروازے پر ایک بکری بندھی رہتی تھی۔ بکری سلیم اختر کی نہیں تھی کہ سلیم اختر کبھی گاندھی جی کے چیلے نہیں رہے اور نہ وہ تصوف کے اس مقام پر پہنچے ہیں جہاں علائق دنیا سے ناطہ توڑ کر وہ بکری کو اپنا ہم سفر اور ہم صفیر بنائیں اور راہ جنگل کی لیں وہ بکری کسی اور کی تھی البتہ دروازہ سلیم اختر کا تھا۔ بکری دودھ بھی دیتی تھی اور بچے بھی۔ بکری کے بچوں نے سلیم اختر کو ایک افسانہ (بکری) دیا اور اس کے دودھ نے انہیں اس دنیا کے بارے میں ایک خاص نقطہ نظر اور فلسفیانہ بصیرت عطا کی۔ بکری دودھ دیتی مگر مینگنیوں بھرا۔ جب بھی دودھ دیتی کسی نہ کسی بہانے چھلانگ لگا کر اس میں مینگنیاں ضرور کر دیتی۔ اس سے سلیم اختر نے یہ جانا کہ یہ دنیا بھی مینگنیوں بھرا دودھ ہے۔ کہ نہ پینے کا نہ پھینکنے کا۔ لیکن جیسا کہ میں نے پہلے کہا سلیم اختر کے اندر کوئی سادھو سنت یا صوفی صافی چھپا نہیں بیٹھا کہ وہ اس دودھ کو گندے پانی میں بہاتے اور خالی کٹورہ بجاتے جنگل سدھارتے۔ سلیم اختر اگر کسی مقام پر ہیں تو وہ ترکِ ترک کا مقام ہے کہ دنیا کو پوری طرح استعمال کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ انہوں نے دنیا کے ہر موضوع کی بے شمار کتابوں کا جو بوجھ اپنے دماغ پر اٹھا رکھا ہے اس نے انہیں یہ سکھایا ہے کہ اس دودھ سے مینگنیاں نکالو۔ صرف مینگنیاں ہی نہ نکالو بلکہ اسے دوبارہ پاک صاف کر کے اس کی اصل شکل میں لانے کی کوشش کرو۔ اب سلیم اختر ہیں اور یہ مینگنیوں بھرا دودھ۔ کبھی افسانوں کے واسطے سے اور کبھی تنقیدی اور تخلیقی مضامین کے ذریعہ اس دودھ کو دوبارہ پاک صاف کرنے کی ناممکن اور ناکام کوشش میں جتے ہوئے ہیں۔

سلیم اختر نے نفسیات اور جنسیات کو اپنا خاص موضوع بنایا ہے۔ بظاہر یہ بات عجیب سی لگتی ہے کہ اردو کے استاد اور نفسیات و جنسیات سے شغف؟ لیکن غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی وجہ بھی وہی دودھ والی ہے وہ انسان کی فطری اور جبلی صلاحیتوں کو صدیوں کی گہری نیند سے بیدار کر کے اسے "خالص آدمی" — اور شاید وہی پورا آدمی بھی ہو — بنانے کی فکر میں رہتے ہیں۔ تاہم وہ یہ بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ ڈی ایچ لارنس اور مارکی دا ساد سے ہنری ملر اور سلیم احمد تک اور سلیم احمد سے ولیم بروز تک کوئی بھی اس مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ ولیم بروز اور برائیگن کے قبیلے کے لوگ تو آخر کار گروپ سیکس اور WIFE SWAPPING تک آ گئے ہیں۔ اب دیکھئے سلیم اختر کہاں تک جاتے ہیں۔

بہرحال یہ طے ہے کہ سلیم اختر کی پہلی اور آخری دلچسپی نفسیات اور جنسیات ہیں۔ حتیٰ کہ ادب بھی اسی حوالہ سے ان کے سامنے آتا ہے۔ ان موضوعات سے ان کے شغف کا یہ عالم ہے کہ انہوں نے اپنی پہلی بچی کا نام سائیکی رکھا، اور ان کی پہلی کتاب کا نام "عورت، جنس اور جذبات" ہے۔

میری ان باتوں سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ سلیم اختر کوئی بہت ہی ڈان وان قسم کے آدمی ہوں گے۔ بڑی ہنگامہ خیز شخصیت! اور سلیم اختر اپنی تحریروں سے بھی جو شخصیت بناتے ہیں وہ بھی بروز اور برائیگن والی ہی ہے۔ لیکن حیرت کی بات ہے کہ یہ بالکل غلط تاثر ہے۔ سلیم اختر اپنی نجی زندگی میں اس کے بالکل برعکس ہیں۔ کافی شرمیلے ہیں، کم گو ہیں اور بڑی حد تک مردم بیزار بھی ہیں۔ مردم بیزاری کی بات بعد میں کروں گا، البتہ شرمیلے پن کا ایک واقعہ میں پیش کئے دیتا ہوں اس سے ان کی اپنی نفسیات کا اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے۔

گورنمنٹ کالج ملتان میں جب ایم اے کی کلاسیں شروع ہوئیں تو لڑکوں کے ساتھ لڑکیوں کو بھی داخلہ ملا۔ سلیم اختر ایم اے اردو کو پڑھاتے

تھے جس میں سب سے زیادہ لڑکیاں تھیں۔ وہ کلاس کس طرح قابو کرتے تھے؟ میں نہیں جانتا البتہ ایک بار ان کی جگہ ایک طالبہ (ان کی طالبہ نہیں ان کی شاگرد) نے بڑے زور کا قہقہہ لگاتے ہوئے شکایت بھرے انداز میں کہا کہ کلاس میں تو سلیم صاحب کسی لڑکی کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتے، اتنے بے باک اور بے دھڑک افسانے کیسے لکھ لیتے ہیں؟

خیر اس سے تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس قسم کے افسانے شرمیلے اور جھجکو لوگ ہی لکھ سکتے ہیں۔ کیونکہ ماشاءاللہ سلیم اختر نے بڑے زور شور سے محبت کر کے شادی کی ہے۔ البتہ یہ کہا جا سکتا تھا کہ سلیم اختر کا نفسیاتی تجزیہ ہونا چاہئے مگر اب یہ سطریں لکھتے وقت سوچتا ہوں کہ اگر میں سلیم اختر کا نفسیاتی تجزیہ کرنے بیٹھ گیا، ان کی عملی زندگی اور ان کی تحریروں کے حوالے سے ان کی تحلیل نفسی شروع کر دی تو کہیں میں اپنا ہی تجزیہ نہ کر ڈالوں اور آپ جانتے ہیں کہ ہم سب پہلے ہی SUGGESTION کے ذریعہ اپنی نفسیاتی زندگی کی گاڑی چلا رہے ہیں۔ سلیم اختر میں کم سے کم یہ خوبی تو ہے کہ انہوں نے اس کامپلیکس کو ایک خاص راستے پر لگا دیا ہے اور باقاعدہ منصوبہ بندی کے ساتھ اس سے کام لے رہے ہیں۔

منصوبہ بندی کا ذکر آیا تو مجھے خیال آیا کہ اسی منصوبہ بندی نے انہیں مردم بیزار بھی بنا دیا ہے یا یوں کہہ لیجئے کہ چونکہ وہ لوگوں سے بہت کم ملتے جلتے ہیں اس لئے لوگ انہیں مردم بیزار سمجھنے لگے ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ اپنی بیگم سے ڈرتے ہیں! اس لئے کالج کے بعد زیادہ وقت وہ گھر پر ہی گزارتے ہیں۔ بیگم سے بھی ڈرتے ہوں گے بلکہ ہو سکتا ہے انہوں نے بیگم پر بھی یہی رعب جما رکھا ہو کہ وہ ان سے ڈرتے ہیں لیکن میں پھر کہتا ہوں اور بالکل صحیح کہتا ہوں کہ انہیں گھر پر روکنے والی ہستی ان کی بیگم نہیں ہو سکتی یہ ان کی ادبی و تخلیقی منصوبہ بندی ہے میں نے یہ لکھ تو دیا لیکن مجھے ڈر لگ رہا ہے کہ کہیں سلیم اختر اور ان کی بیگم دونوں مجھ سے ناراض نہ ہو جائیں۔ سلیم اختر اس لئے کہ میں نے ان کی بیگم ترسی کا بھانڈا پھوڑ دیا ہے اور ان کی بیگم اس لئے کہ میں نے ان کا ایک نہایت سہانا 9LLUSION ختم کرنے کی ناکام کوشش کی ہے۔ (خدا کرے کہ یہ کوشش ناکام ہی ہو) ہاں یہ اور بات ہے کہ سلیم اختر کی بیگم واقعی بڑی ڈھنگ خاتون ہیں! اس کے راوی عرش صدیقی ہیں اتنی ڈھنگ کہ سلیم اختر کے مزاج کی ساری کمزوریاں وہ دور کر دیتی ہے۔ اور اس طرح ایک متوازن گھریلو فضا جنم لیتی ہے۔ میں معافی چاہتا ہوں کہ واقعات سے یہ بات ثابت نہیں کر سکتا۔ (اگرچہ میں یہ بھی کر سکتا ہوں)۔

ہاں تو میں ادبی و تخلیقی منصوبہ بندی کا ذکر کر رہا تھا۔ سلیم اختر اپنا ہر کام پورے منصوبے کے ساتھ کرتے ہیں۔ افسانے مضامین اور تحقیق و تالیف ہر شعبہ اور ہر موضوع ان کے کسی خاص منصوبے کے ضمن میں آتا ہے۔ بہت لکھتے ہیں اور بہت تیزی کے ساتھ لکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بہت سے دوست ان سے جلتے ہیں۔ (ان جلنے والوں میں آپ مجھے بھی شامل کر سکتے ہیں۔) اب یہی دیکھیے کہ جو شخص بیک وقت افسانے، تنقیدی اور تحقیقی مقالے اور ہلکے پھلکے مضامین لکھے اور بہت لکھے اور خوب لکھے، اس سے کون نہیں جلے گا۔ یہ منصوبہ بندی کا ذکر بھی جل کر ہی کر رہا ہوں۔

اس منصوبہ بندی میں شاید ان کی وہ تربیت بھی کام آتی ہے جو انہوں نے لائبریری سائنس میں لے رکھی ہے۔ جی ہاں سلیم اختر کے پاس لائبریری سائنس کا ڈپلومہ بھی ہے، اور تجربہ بھی، چنانچہ ان کے پاس جس تربیت، سلیقے اور کیٹلاگنگ کے ساتھ آپ کو کتابیں مل جائیں گی۔ شاید ہی کسی ادیب کے گھر ملیں۔ ہمارے ادیبوں کو اول تو ماشاءاللہ کتابیں رکھنے کا شوق ہی نہیں ہے۔ اور اگر شوق ہے بھی تو ترتیب و سلیقہ نام کی کوئی شے ان کے ہاں نظر نہیں آتی۔ سلیم اختر کتابیں ہی نہیں رسائل کے مضامین اور اخبارات کے ضروری تراشے تک نہایت سلیقے سے رکھتے ہیں اور وقتِ ضرورت ان سے کام لیتے ہیں۔

سلیم اختر لکھتے ہی نہیں پڑھتے بھی ہیں۔ اور بہت پڑھتے ہیں، ہر موضوع پر پڑھتے ہیں۔ سنجیدہ ادب سے پورنو گرافی تک تو میں بھی پڑھ لیتا ہوں، لیکن سلیم اختر جاسوسی اور سائنسی ناول تک نہیں چھوڑتے۔ دراصل مختلف موسموں میں ان کے مختلف موڈ ہوتے ہیں۔ اور ہر موڈ کے ساتھ وہ مختلف چیزیں پڑھتے ہیں گرمیوں میں ہلکی پھلکی کتابیں اور مضامین وغیرہ اور جاڑوں میں سنجیدہ اور ٹھوس چیزیں۔ لکھنے کا سلسلہ بھی کچھ اسی طرح ہے، اکثر رات کو لکھتے ہیں، جب سارا گھر سو جاتا ہے۔ کافی بنا کر رکھ لیتے ہیں۔ اور پیتے رہتے ہیں۔ سب سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ لکھتے وقت ریڈیو پر گانے بھی سنتے جاتے ہیں۔ میں نے کہا آفرین ہے تمہارے اور پر سلیم اختر کہ تم نے یکسوئی حاصل کرنے کے لئے کیا کیا طریقے اختیار کر رکھے ہیں۔ یہ یکسوئی کے ساتھ پڑھنے، سوچنے اور لکھنے کی بات ہی تو ہے کہ اپنے ہر مقالے اور افسانے میں وہ ایسا نکتہ پیدا کرتے ہیں کہ پڑھنے والے کو حیران کر دیتے ہیں۔ خواہ وہ "زلیس سے امیر حمزہ تک" مقالہ ہو یا "جلے پاؤں کی بلی" افسانہ۔ ہر تحریر میں آپ

کو کوئی نہ کوئی ایسا نکتہ ضرور نظر آئے گا جو آپ کو چونکا دے۔ اور ظاہر ہے یہ کام یکسوئی کے ساتھ سوچے سمجھے بغیر ہرگز نہیں ہو سکتا۔

سلیم اختر کے پڑھنے اور مطالعہ کرنے کا ذکر آیا ہے تو میں ایک ذاتی محرومی کا ذکر بھی کر دوں۔ سلیم اختر کے ملتان چھوڑ کر لاہور جانے سے مجھے یہ نقصان ہوا کہ کافی عرصے تک یورپ کی عالمی تحریکیں اور نئی کتابوں اور نئی فلموں پر بات کرنے والا کوئی نہیں ملتا تھا۔ اب گزشتہ دو سال سے ملتان میں چند نوجوان ایسے سامنے آئے ہیں۔ جو جدید ترین عالمی ادب کا مطالعہ کرنے کا شوق رکھتے ہیں۔ اور واقعی خوب پڑھتے ہیں ورنہ سلیم اختر اور نذیر احمد کے ملتان سے لاہور اور اسلام آباد سدھارنے کے بعد مجھے بہت بڑا نقصان ہوا تھا۔ سلیم اختر عالمی ادب اور فلم و تھیٹر کی جدید ترین عالمی تحریکوں کا بغور مطالعہ کرتے رہتے ہیں۔ نئی فکشن ہو یا نئی فلم سلیم اختر اس کے ہر پہلو کے بارے میں آپ سے ہر وقت بات کرنے کو آمادہ ملیں گے۔

وہ جس اتھارٹی کے ساتھ جان بارتھ کے ناول "گوٹ بوائے" اور "شیرا" کی علامتوں اور استعاروں کی گتھی سلجھا سکتے ہیں اسی تیقن کے ساتھ جین مینسفیلڈ کی ۱۲۰ انچ کی کمر اور بیالیس انچ کے سینے کے بارے میں بھی بات کر سکتے ہیں کہ مرحومہ کے بعد یہ شاندار پیمائش کسی کو نصیب نہیں ہوئی۔ سلیم اختر بڑے مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں کہ مرحومہ کے شوہر کی گردن اور مرحومہ کی کمر کا ناپ ایک ہی تھا۔

بہرحال میں اپنا ذکر خواہ مخواہ لے بیٹھا میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ سلیم اختر جدید ترین عالمی ادب، فلم، تھیٹر اور آرٹ کا انسائیکلوپیڈیا ہیں، خواہ وہ پہلی ملاقات میں کسی کو مرعوب نہ کر سکیں لیکن ان سے مسلسل ملاقاتیں خاصی سودمند ثابت ہوتی ہیں۔

پہلی ملاقات کا ذکر آیا تو عرض کر دوں کہ سلیم اختر اپنی ملاقات میں یقیناً متاثر نہیں کرتے، ان کے بات کرنے کا انداز بہت سیدھا سادہ اور شرمیلے پن والا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ نہ تو وہ سیدھے سادے ہیں، اور نہ شرمیلے، ہو سکتا ہے دھوکہ دینے کے لئے یہ انداز انہوں نے اختیار کر رکھا ہو۔ لڑکیاں ان کے بارے میں خواہ کچھ ہی کہیں، بہرحال اپنے شاگردوں میں وہ اسی انداز کی وجہ سے بے پناہ مقبول رہتے ہیں۔ ان کے شاگرد فوراً انہیں اپنا دوست سمجھنے لگتے ہیں۔ اور سلیم اختر ان سے اپنے مضامین کی کاپیاں کرانے لگتے ہیں۔ وہ بلند بانگ نعرے لگانے والوں کی کبھی پرواہ نہیں کرتے کوئی ان کی شخصیت سے متاثر ہو نہ ہو وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتے۔

ایک اور بات۔ سلیم اختر کبھی کسی سے ناراض نہیں ہوتے ان پر کیا کیا تنقیدیں نہیں کی گئیں، خاص طور سے ان کی کتاب "اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ" نے کتنے دوستوں کو ناراض نہیں کیا کہ دوست سب سے پہلے اپنا نام دیکھنا چاہتے تھے۔ مگر ان کے بھاؤں پر سیل تک نہیں آیا۔ ان کی دوستی ہر ایک سے برقرار رہی جب بھی ملے ہنستے مسکراتے اور یہ ظاہر ہی نہیں ہونے دیا کسی نے کبھی کچھ کہا تھا۔ جہاں تک ان کا تعلق ہے میں نے آٹھ دس سال میں ایک بار بھی ان کی زبان سے کسی کی برائی نہیں سنی اور شاید یہی وجہ ہے کہ پاکستان کے ادبی حلقوں میں جتنے بھی گروپ اور اسکول پائے جاتے ہیں سلیم اختر سب ہی کے منظور نظر ہیں۔ ہر ایک سے ان کی برابر کی دوستی ہے، سب انہیں اپنا سمجھتے ہیں۔ اور یہ بھی وہ سب کے کسی کی برائی نہیں چاہتے۔ سب کے ہمدرد اور سب کے خیر خواہ ہیں کسی سے اختلاف ہے بھی تو خالص ادبی اور اس میں کسی کی خفگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ملتان میں تو خیر ایسے ادبی گروہ ہی کتنے ہیں کہ جھگڑے ٹنٹے کا سوال پیدا ہو لیکن حیرت یہ ہوتی ہے کہ سلیم اختر نے لاہور میں بھی سب کے ساتھ یکساں تعلق بنا رکھا ہے اور یہ ان کی سب سے بڑی خوبی اور سب سے بڑی کامیابی ہے۔

سلیم اختر جس تیزی سے لکھتے اور پڑھتے ہیں اسی تیز رفتاری سے سڑک پر چلتے ہیں۔ اپنی لمبی لمبی ٹانگوں کو ایک خاص انداز میں جھٹکا دے کر جب چلتے ہیں تو مجھ جیسے چھوٹے قد کے لئے بھی ان کا ساتھ دینا مشکل ہو جاتا ہے۔ وہ چلتے نہیں دوڑ لگاتے ہیں۔ خواہ چہل قدمی کو ہی کیوں نہ نکلے ہوں چلیں گے ایسے جیسے نہایت ضروری کام سے کہیں جا رہے ہوں۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے جیسے وہ ساری دنیا کا کام جلد سے جلد مکمل کرنے کی دھن میں لگے رہتے ہیں۔ گویا قاضی نذرالاسلام کے گیت "بیلا نائی رے جو سری جو سری" سے سبق صرف انہوں نے سیکھا ہے اور اس پر عمل کرنے کی بوجھل اور بھاری ذمہ داری بھی جیسے صرف ان کے نازک ناتواں کاندھوں پر آ پڑی ہے۔ "وقت نہیں ہے جلدی جلدی کر دو" ــــ اور پھر میں سوچتا ہوں وہ اچھا کرتے ہیں بلکہ بہت اچھا کرتے ہیں جو پڑھتے ہیں اس میں فوراً دوسروں کو شریک کر لیتے ہیں۔ اور کسی قسم کی جھجک INHABITION اور TABOOS کے بغیر یہ سب کام کرتے ہیں۔ اب آپ ہی بتائیے اس سے بڑا ثواب کا کام اور کیا ہو سکتا ہے؟ اس میگنیوں بھرے دودھ کو شاید اسی طرح پاک صاف کیا جا سکے۔

بشکریہ: سیپ کراچی، شمارہ ۳۲

لطیف الزماں خاں

سخنور

ہر کوتاہ قد نے دراز قد انسان پر پتھر پھینکے ہیں۔

گیہواں رنگ، آنکھیں چھوٹی جن میں سفید ی زیادہ سیاہی کم، بجھی بجھی سی، سر پر خوبصورت بال، درمیان میں مانگ، چہرہ لمبوترا، ناک لانبی، اور دہانہ کسی قدر چوڑا۔ دانت بالکل سفید، نہ پان کھائیں نہ سگریٹ پئیں۔ سوٹ نہ بہت اچھا نہ بہت برا، لیس درمیانہ درجہ کا، جوتا براؤن رنگ کا، ہاتھ میں حاضری کا رجسٹر اور ایک چرمی بیگ، ایک صاحب دراز قد، تیر کی طرح سیدھے، ناک، پر عینک جمائے چلے جا رہے تھے۔ میں نے پوچھا "یہ کون صاحب ہیں؟" جواب ملا "سلیم"۔ معاً مجھے خیال آیا ضرور ماں کے لاڈلے ہوں گے۔ ورنہ تاریخ میں ایک ہی سلیم ہوا ہے، شہزادہ سلیم جو شعلہ بجاں تھا، عشق میں رسوائے جہاں ہوا۔ اس کی زندگی کا یہ رخ ایک ناول کا موضوع بنا۔ اس کے قصے برصغیر کی مسلمان ماؤں کے لاشعور کا حصہ ہیں۔ بیشتر مائیں اپنے نوجوان بیٹوں کو شہزادہ سلیم ہی تو سمجھتی ہیں۔

روز کلاس روم میں جانا اور پھر سیدھے اسٹاف روم میں، نہ کسی سے بات کریں نہ مسکرائیں۔ میں نے ایک اور رفیقِ کار سے پوچھا "کیوں جناب! یہ صاحب کون ہیں؟"۔ "اختر"۔ میں چونکا، خیال آتا ہے کہ اردو ادب میں کیسے کیسے اختر ہوئے ہیں ——— ایک وہ جو اختر یمانی تھے۔ اختر، جو عذرا، ریحانہ اور سلمیٰ کے خالق ہیں، محبوبہ سے براہ راست ہم کلام ہونے والے، اردو کی رومانی اور عشقیہ شاعری میں ایک نئی روایت قائم کرنے والے ——— اختر، جنھوں نے افادی ادب، افسانے، قطعات اور ادبی ڈائری لکھی، جو ادبی لطافتوں کے پارکھ ہیں مگر درباریوں کی دربار داری سے متنفر، اسی لئے زندگی کا بڑا حصہ اسکول میں گزار دیا ——— اختر اورینوی ناقد، افسانہ نگار، ستم اور سوا کے بیمار، جو شائستگی کا پیکر تھے، جن کی فیاضی اور کشادہ قلبی کے قصے سید صفدر امام سناتے ہوئے نہیں تھکتے ——— اختر، جو نام ہی کے جاں نثار نہ تھے، جنھیں دعویٰ جاں نثاری بھی تھا، صفیہ جیسی زیرِ لب گفتگو کرنے والی بیوی مر گئی تو ایک اور شادی رچالی ——— اختر، ایمان جن کے نام کا حصہ ہے، اور ایمان کی بات ہے کہ بڑے شاعر ہیں۔ انسانی کمزوریوں کو قابل عفو سمجھتے ہیں۔ انسان سے پیار کرتے ہیں۔ اس کے معائب و نقائص کو جاننے کے باوجود اس کی دلکشی و دلآویزی کے گیت گاتے ہیں ——— اختر، جن کے بارے میں کسی نے کہا "یہ منحوس صورت یہ اختر تخلص" اور نصف مصرعہ ہے "دیوانہ ہوا ہے" ——— اختر، جو استاد کہلاتے ہیں، جنھیں ان کے احباب قیصر اردو کی وجہ بربادی سمجھتے ہیں ——— غرض بے شمار اختر یاد آئے ہیں۔ اب ایک اور اختر۔ میں ابھی خیال و خواب کی دنیا سے باہر نہیں آیا تھا کہ ایک صاحب نے جھنجوڑ ڈالا: "آج گلڈ کے جلسہ میں چلنا ہے"۔ میں نے کہا "کباب کھانے کیوں نہ چلیں، ادبی جلسہ میں تو وقت ہی ضائع ہوگا۔"

"کباب بعد میں کھائیں گے، پہلے سلیم اختر کا افسانہ سنیں گے۔"

اچھا تو "یہ چُھپا رُستم افسانے بھی لکھتا ہے" میں نے سوچا۔ یہ شخص جو بول کر نہیں دیتا افسانے کیسے لکھتا ہوگا۔

ملتان میں پرانی وضع کے ایک بزرگ مرحوم حمید الدین کاکوروی صاحب تھے۔ پرانی طرز کا شعر کہتے لیکن ادب اور ادیبوں سے پیار کرتے تھے۔ انھوں نے اپنے ہوٹل کا نام گلڈ ہوٹل رکھ لیا تھا۔ عمارت کی پہلی منزل پر دو کمرے انھوں نے گلڈ کو دے دیے تھے۔ ایک کمرے میں لائبریری تھی، دوسرا کمرہ ہفتہ وار ادبی اجلاس کے لئے وقف تھا۔ عمدہ کرسیاں، فرش پر دری، صوفے، ڈائس، روشنی کا عمدہ انتظام۔ یہ سب کچھ مرحوم کے ایثار کا ہلکا سا پرتو ہے۔

فیاض تحسین نے اطلاع دی "سلیم اختر تنقید بھی لکھتے ہیں"۔ میں نے دل میں دعا مانگی "یا اللہ بہ شرنہ کہتا ہو"۔ افسانہ پڑھا گیا عنوان تھا "بکری"۔ حاضرین نے بڑی تعریف کی۔ ادب میں مشکل ترین کام ہی یہ ہے کہ کسی فن پارے کی تعریف کی جائے۔ لوگ اسے آسان کام سمجھ کر الفاظ کا بے جا اسراف کر رہے تھے۔ ترقی پسند افسانہ، حد سے زیادہ وضاحتی انداز، چند ناپختہ ذہنوں کی نعرہ بازی اور کہیں کہیں سفاکانہ حقیقت نگاری کے باعث اپنا تاریخی رول ادا کر چکا تھا۔ اور بات کچھ یوں تھی کہ ۱۹۵۸ء ہی سے صاف اور واضح الفاظ میں گفتگو ہو بھی نہیں سکتی تھی، یہ عیوب و ذمائم کا زمانہ تھا۔ اردو ادب میں طرزِ اظہار بدل چکا تھا، علامتی اسلوب جڑ پکڑ چکا تھا اور نفسیاتی افسانہ راہیں تلاش کر رہا تھا۔

گورنمنٹ کالج ملتان میں کئی اقسام کے اساتذہ تھے۔ پروفیسر نذیر احمد اردو افسانے کے بڑے اچھے پارکھ تھے۔ راست بازی اور صداقت شعاری اُن کے ایمان کا حصہ تھا۔ بعض ایسے تھے جو پیسے ہی کو اصل حقیقت سمجھتے۔ کچھ ایسے جنھوں نے ملازمت کو فن بنا دیا تھا۔ پڑھنے لکھنے، پڑھانے، ادب و شعر جیسی لغویات میں نہ پڑتے۔ ایک صاحب کا اسٹاف میں اضافہ ہوا۔ بالکل سینک سلائی۔ دبیز شیشوں کی عینک لگاتے، اردو ادب پر بات کرتے تو انگریز ناقدین کا حوالہ دیتے۔ یہ حضرت لاہور سے آئے تھے اور ہر شرعی عیب انتقاماً کرتے تھے۔ ان کا قول تھا کہ وہ ہر کام ٹکا کر کرتے ہیں۔

ایک دن مل گئے، گھومتے ہوئے دولت گیٹ پہنچ گئے۔ مجھے اور فیاض تحسین کو گھنٹہ گھر کے سامنے کھڑا کر کے غائب ہوگئے۔ کچھ دیر کے بعد آئے تو بہت خوش نظر آتے تھے۔ "یار میں راستہ بھول گیا مگر منزل پر پہنچ گیا تھا۔ چلو" "کہاں؟" "سلیم اختر کے گھر اور کہاں"

ملتان کا ایک محلہ نواں شہر کہلاتا ہے۔ انکم ٹیکس کے دفاتر کی پشت پر کئی گلیاں ہیں۔ ان میں سے کبھی ایک گلی کا نام پریم گلی تھا اب وہ اسلامی گلی ہے۔ ذرا آگے بڑھیں، سیدھے ہاتھ کی ایک بند گلی کے آخری مکان میں سلیم اختر رہتے تھے۔ سامنے ایک بکری بندھی تھی۔

یوں تو چھوٹی سی ذات بکری کی مگر اس چھوٹی ذات کی بات اقبال کو بھاتی تھی اور سلیم اختر کے لئے ایک افسانہ کی تخلیق کا باعث بنی۔ ٹاٹ کا پردہ لٹک رہا تھا۔ گویا ثقافت کا ایک حصہ ہنوز باقی تھا۔ سلیم اختر نے خوش آمدید کہا اور صحن میں لے جا کر بٹھا دیا۔ تب حضرتِ سینک سلائی نے شراب کی بوتل نکالی اور میز پر رکھ دی۔ میں اور فیاض تحسین دونوں گھبرائے مگر سلیم اختر بالکل نارمل تھے، جیسے کوئی بات ہوئی ہی نہ تھی۔ وہ برف، جگ میں پانی اور بازار سے کباب لائے۔ سینک سلائی نے اپنا شغل جاری رکھا۔ کوئی ان کا شریک نہ تھا۔ شراب کو کباب سے بوٹ کیا اور بہکنے لگے۔ میں اٹھ کر کمرے میں چلا گیا۔ کتابیں مختصر تھیں مگر بڑے سلیقے سے رکھی ہوئی تھیں۔ میں سلیم اختر سے بے تکلف نہ تھا اس لئے پوچھ نہ سکا کہ انھوں نے اس امر کی اجازت کیونکر دی کہ دوسرے احباب بدمزہ ہوں۔ کچھ مدت کے بعد معلوم ہوا کہ حضرت سینک سلائی نے پاک ٹی ہاؤس میں پہلے تو محمد علی کلے بننے کی کوشش کی اور پھر مادر زاد برہنہ ہو کر، دروازے سے برآمد ہوئے۔ پاک ٹی ہاؤس میں طویل عرصے سے ایک عدد درجہ شریف انسان کام کرتا ہے، الہی۔ اسی الہی نے موصوف کو پولیس اور پولیس سے بچایا اور پھر وہ مظفر علی سید صاحب کی طرح افسروں کو انگریزی پڑھانے چلے گئے۔

اس واقعے سے ایک بات تو معلوم ہوتی ہے کہ دشمنانِ عقل و ذوق سے واسطہ پڑ جائے تب بھی سلیم اختر ہوش و حواس قائم رکھتے ہیں۔

انھوں نے اپنے گرد ایک حصار کھینچ رکھا ہے۔ اس حصار سے باہر جو کچھ ہو سو ہو افسردہ سُوقیانہ حرکات کو جگہ دیتے ہیں نہ غلیظ باتوں کو، نہ جنسِ نازک کی کافرماجرائی کو، نہ عشوہ زائی کو۔ جن لوگوں کی رگوں میں کید و فریب خون کی طرح گردش میں ہے وہ اپنی تمام فرعون سامانی کے باوجود نہ اس حصار میں داخل ہو سکتے ہیں نہ انھیں مشتعل کر سکتے ہیں۔ کوئی بد اخلاق اور بد مزاجی پر اتر آئے تب بھی ان کا لہجہ اشتعال انگیز نہیں ہو سکتا۔ سلیم صاحب عملی زندگی میں پیش آنے والے واقعات سے ان باتوں کی تصدیق و توثیق یا توثیق و عدم توثیق کرتے ہیں، جو علم نفسیات سے انھوں نے حاصل کی ہیں۔ ایک چشمہ تو وہ ہے جو کم نگاہی کی وجہ سے وہ استعمال کرتے ہیں اور دوسری عینک نفسیات کی ہے جس سے وہ ہر انسان کو دیکھتے ہیں اور خود اپنی ذات کو بھی۔ وہ بے حد محنتی انسان ہیں۔ کام کی نوعیت خواہ کچھ ہو ان کا پورا وجود اس میں شامل ہوتا ہے۔ جذبات، عقل، دل و دماغ، تمام قوتوں سے کام لیں گے۔ ایم اے کے طلبا و طالبات کو اردو تنقید پڑھاتے تھے، نصاب انگریزی میں تھا۔ بہترین نوٹس تیار کرتے، ایک ایک بات سمجھاتے۔ کلاس روم سے واپس آتے تو پیشانی پر پسینے کے قطرے ہوتے۔ پانی کے کئی گلاس یکے بعد دیگرے پیتے، پھر بھی بے حال ہی رہتے۔ مرحوم حسن عسکری صاحب نے ہمیشہ وہ کلاس پڑھائی جس میں انگریزی ادب پڑھنے والے طلبا ہوتے۔ لازمی انگریزی پڑھنے والوں کی طرف مرحوم نے کبھی رُخ نہیں کیا۔ کلاس میں لڑکیاں ہوتیں تو عسکری صاحب کو چُپ لگ جاتی۔ جب تک وہ اتنے بے تکلف نہ ہو جاتے کہ "زین الدین ذرا سگریٹ تو لے آؤ" یا "میاں باقر (سجاد باقر رضوی) آپ کی جیب میں سگریٹ ہوگی" ہرگز نہ پڑھا پاتے، لیکن جب سجاد باقر رضوی سگریٹ پیش کرتے تو پھر اس کے ایک ہی معنی تھے کہ اب عسکری صاحب پڑھائیں گے، اور جب وہ پڑھاتے تو معلوم ہوتا کہ واقعی علم دریا ہے۔ پھر نیلوفر ہوں یا نسیم، عسکری صاحب کے لئے ایک عام طالبہ ہوتیں۔ لیکن سلیم اختر کی کلاس میں لڑکیاں ہوں تو یہ آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔ تن کے کپڑے پسینے سے شرابور، دماغ سائیں سائیں کر رہا ہے اور یہ حضرت نظریں نیچی کئے شرمائے ہوئے نوٹس لکھا رہے ہیں۔

مرحوم رشید احمد صدیقی صاحب نے ایک جگہ لکھا ہے "اچھے معلم کی پہچان یہ بتائی گئی ہے کہ اس کا علم متعدی ہو۔" اس قول کی روشنی میں سلیم اختر کو دیکھئے، مایوسی نہ ہوگی۔ اُن کے بعض طالب علموں نے کام کیا اور بڑا نام پایا۔ اور سب کے سب معترف ہیں کہ یہ استاد کی دین ہے۔ یہ باتیں اس زمانے کی ہیں جب وہ صرف سلیم اختر تھے ڈاکٹر سلیم اختر نہ ہوتے تھے۔

نوشابہ نرگس، امروز ملتان میں کام کرتی ہیں۔ غزل کہتی ہیں، نثر لکھتی ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ سلیم اختر صاحب تنقید پڑھاتے تو موضوع اور نفس مضمون میں مکمل طور پر INVOLVEMENT پیدا کرنے میں ہمیشہ کامیاب ہوتے۔ تنقید کہ اس کا دوسرا نام تخلیق نو ہے، اسے وابستگی کے بغیر پڑھایا ہی نہیں جا سکتا۔ انگریز ناقدین کے افکار و خیالات کو اردو میں ڈھالنا اور طرزِ استدلال ایسا کہ اپنائیت کا احساس ہو، یہ سلیم صاحب کے کمالات میں سے تھا۔ نوشابہ کا خیال ہے کہ وہ اپنے شاگردوں کے ذہنی سفر میں بھی شریک رہتے اور ہر قدم پر اُسے اس کی موجودگی کا احساس بھی دلاتے۔ شاگرد کی انفرادیت بھی قائم رہے اور وہ خود کو تنہا بھی محسوس نہ کرے۔ کبھی یہ بھی ہوتا کہ طلبا کا جی موضوع کی سنجیدگی سے گھبرا جاتا اور اُسے برداشت نہ کر پاتا تو سلیم صاحب دیگر موضوعات پر گفتگو شروع کر دیتے، اور دلچسپ جملوں میں باتیں ذہن نشین کرتے چلے جاتے۔ نوشابہ کا خیال ہے کہ ایک چیز، جسے سلیم صاحب آج تک ترک نہیں کر سکے وہ اُن کا شرمیلاپن یعنی SHYNESS ہے، اور یہ بات اس لئے بھی قابلِ یقین ہے کہ نوشابہ اُن کی سب سے معتبر شاگرد ہے۔ اُن کے شاگرد گھر پہنچ جاتے تب بھی وہ بغیر کسی معاوضہ کے اُن کی مدد اور رہنمائی کرتے۔

اُن کے ایک شاگرد اصغر ندیم سید ہیں۔ ابتدا میں بڑے شرمیلے تھے، آہستہ آہستہ اُن کے جوہر کھلے۔ شاعری، افسانہ، ڈرامہ، نظموں کے تراجم اور کالم نگاری، غرض سبھی منازل طے کر گئے۔ اُن کی شہرت کسی کی مرہونِ منت نہیں۔ سید نے صاحب دل اور صاحب نظر ہونے کا دعویٰ کبھی نہیں کیا۔ مگر یہ عاقل و فرزانہ شخص پہچانتا ہے کہ قوتِ حیات کے سوتے کہاں پھوٹتے ہیں۔ اُس نے

سختیاں جھیلیں مگر راستے اور منزلِ مقصود کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھا۔ سلیم اختر نے انھیں یہ تربیت دی کہ اصلاح اور ترقی کی راہ کٹھن ہی لیکن اسے کسی قیمت پر ترک نہیں کیا جا سکتا۔

یحییٰ امجد کی افسری نے ادب کو کچل دیا ہے ورنہ اردو میں خاکہ نگاری اور اصغر پر لاجواب مضامین انھوں نے ہی لکھے تھے۔ سلیم صاحب کے ایک شاگرد رؤف شیخ ہیں۔ بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی ملتان کے شعبۂ اردو میں معلم ہیں۔ مرحوم سید عابد علی عابد پر ڈاکٹریٹ کر رہے ہیں۔ سلیم اختر صاحب سے انھوں نے یہ بات سیکھی ہے کہ آویزش اور کشمکش سے دور رہو اور مصلحت آمیز مفاہمت ہرگز نہ کرو۔ رؤف نازک اور پیچیدہ مسائل کو صرف اپنے طور پر سلجھانے کے قائل ہیں۔ رؤف اپنے اخلاق اور اعمال میں سلیم صاحب کے ایسے شاگرد ہیں جو ادب کی روح کا عرفان رکھتے ہیں۔

انوار احمد صاحب، رؤف صاحب کے رفیقِ کار تو ہیں لیکن سلیم اختر سے انھوں نے اجتہادی اسلوبِ بصیرت حاصل کی ہے۔ وہ ارتباط و اختلاط میں سلیم صاحب ہی کی طرح محتاط ہیں۔ ان کی صلاحیتیں مرتبہ و معیار کی ہیں۔ انوار زندگی پر ہنسنے کا سلیقہ جانتے ہیں۔ کم مایہ اور ناقابلِ التفات لوگوں کو منہ نہیں لگاتے۔ بات موثر اور قابلِ قبول کرتے ہیں۔ بے حد ذہین، دوستوں پر جان چھڑکنے والے، آزاد فکر کے حامل، بیدار مغز اور روشن دماغ انوار احمد اپنے استاد سلیم اختر صاحب کی باتوں اور یادوں کو دل سے لگائے ہوتے ہیں۔ اردو ادب کی تنقید تو دراصل شاعری تک محدود ہے۔ انوار صاحب نے مشکل موضوع پسند کیا۔ وہ اردو افسانے کے سیاسی و سماجی پس منظر پر ڈاکٹریٹ کا مقالہ لکھ رہے ہیں۔

دہلوی، لکھنوی اور لاہوری تو بے شمار ہیں لیکن تونسوی صرف دو ہیں۔ فلک برسوں پھرے گا تو تونسہ کی سرزمین سے انسان پیدا ہوگا۔ ہندوستان تقسیم ہوا تو فکر تونسوی نے دلی میں ڈیرے ڈالے۔ اللہ کو مسبب الاسباب یونہی تو نہیں کہتے۔ اس ربِ کریم نے ہمیں طاہر تونسوی دیا اور کیا خوب دیا۔ نڈر تو اور بھی بہت سے لوگ ہوتے ہیں لیکن ادب کے میدان میں نڈر ہونا مشکل کام ہے کہ اس میں محنت زیادہ پڑتی ہے۔ مشاہدہ و مطالعہ تو ہر ادیب کے لئے ضروری سمجھا ہی گیا ہے، لیکن طاہر ادبی بددیانتی کو سب سے بڑا گناہ سمجھتے ہیں۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ بڑوں کا ادب نہیں کرتے، لیکن خود ساختہ اسکالرز اور اسکولز کی دروغ گوئی کو برداشت کرنا طاہر کے نزدیک کفر کے مترادف ہے۔ طاہر اس حد تک صاف گو ہیں کہ برسرِ محفل سچ بات کہنے کو کارِ ثواب سمجھتے ہیں۔ سید مسعود حسین رضوی ادیب مرحوم کی حیات اور کارناموں پر کام کرنے والے شخص سے یہی امید کی جا سکتی ہے۔

طاہر کہتے ہیں کہ سلیم صاحب کلاس روم میں سر جھکائے جاتے ہیں، پڑھانے کے علاوہ کوئی بات نہیں کرتے، پیریڈ ختم ہوا تو گردن جھکائے اسٹاف روم کی طرف چل دیں گے لیکن اگر کسی سے ناراض ہو جائیں تو معاف نہیں کرتے۔ مجھے طاہر کی اس بات سے اختلاف ہے۔ سلیم اختر کا خمیر اس مٹی سے اٹھا ہی نہیں کہ وہ کسی سے ناراض ہوں یا لڑ سکیں ـــــ ادب میں اختلاف کو ناراضگی یا لڑائی نہیں کہا جاتا۔ جب ڈاکٹر وزیر آغا صاحب کی کتاب اردو شاعری کا مزاج شائع ہوئی تو سلیم احمد نے لکھا تھا "اس کتاب میں اور بہت کچھ ہے لیکن اردو شاعری کا مزاج نہیں ہے"، تو اس کے یہ معنی کب ہوئے کہ سلیم احمد ڈاکٹر وزیر آغا سے ناراض ہو رہے ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا صاحب خود کو انشائیہ کا موجد سمجھتے ہیں۔ اگر ڈاکٹر سلیم اختر یہ ثابت کرتے ہیں کہ انشائیہ ان کی ایجاد نہیں تو وہ نہ کسی سے لڑ رہے ہیں نہ ناراض ہو رہے ہیں۔ محقق کا کام ہی یہ ہے کہ صحیح بات ماضی کے دبیز پردوں سے نکال لائے۔ انصاف یہ ہے کہ اگر کسی صاحب کو ڈاکٹر سلیم کی رائے سے اختلاف ہے تو اس کا جواب تحقیقِ مزید سے دیا جانا چاہیئے گالی گلوچ سے نہیں۔

سلیم اختر کی بڑائی اس میں ہے کہ انھوں نے کسی لغو اور بیہودہ تحریر کا نوٹس ہی نہیں لیا کہ فارسی میں کہا گیا ہے "جوابِ جاہلاں باشد خموشی"

راوی اس بات کے افتخار حسین شاہ ہیں کہ سلیم اختر کی شادی محبت اور عشق کے منازل طے کرنے کے بعد ہوئی، حیرت تو ضرور ہوئی لیکن راوی چونکہ معتبر ہے اس لئے سوائے یقین کرنے کے چارہ نہیں۔ تین بچے سائیکی، ارم اور جودت جس کے نام پر لاہور میں مکان کا نام "الجودت" رکھا گیا۔ طاہر تونسوی اور اے بی اشرف قسم کھا کر کہتے ہیں کہ سلیم اختر بیوی سے بہت ڈرتے ہیں لیکن میں اس بات کو تسلیم نہیں کرتا۔ جو باپ بچوں سے محبت کرتا ہو، جس نے گھر کے کام بیوی کے سپرد کر دیئے ہوں۔ بات بات پہ بیوی سے نہ جھگڑتا ہو، اس سے یہ نتیجہ نکالنا

کہ بیوی سے ڈرتے ہیں، غلط ہے۔ سلیم اختر تو بیوی کو دوست سمجھتے ہیں یقین نہ آئے تو ران کی کتاب "عورت، جنس اور جذبات" ملاحظہ فرمائیے۔ جسے دوست سمجھا جائے اس سے ڈرا نہیں جاتا پیار کیا جاتا ہے۔ سلیم صاحب نے ملتان میں قطعۂ زمین خرید لیا تھا لیکن جب بیگم نے کہا کہ "چلو لاہور چلو" تو تابع فرمان شوہر اور دوست بوریا بستر باندھ کر لاہور چل دیا۔

بات دراصل یہ ہے کہ ہر سمجھ دار شوہر کی مانند سلیم اختر گھر کے جھگڑوں سے دور رہتے ہیں۔ اسی لئے تو تخلیقی کام کر لیتے ہیں، پچیس کتابوں کا مصنف ہونا کھیل نہیں ہے۔ تنقید، اقبالیات، افسانہ نگاری، طنز نگاری، خاکہ نگاری اور ناول نویسی، ان اصناف کو سلیقے سے نبھانا اور ہر ایک کو یکساں اہمیت دینے کے لئے جس سکون کی ضرورت ہوتی ہے وہ کسی سے لڑ جھگڑ کر اور بالخصوص بیوی سے لڑ کر حاصل نہیں ہو سکتا۔ اپنی توتوں کو لڑ جھگڑ کر یا ہوٹلوں میں وقت ضائع کرنے سے یہ بہتر ہے کہ گوشہ نشینی اختیار کی جائے اور تخلیقی کام کیا جائے۔

سلیم اختر نے پنجاب پبلک لائبریری لاہور سے اپنا کیرئیر شروع کیا، ایم اے کیا، ڈاکٹریٹ کا مقالہ لکھا، پچیس کتابوں کے مصنف ہوئے۔ یہ سب کچھ ان کے محنتی ہونے کے ثبوت ہیں۔ انھوں نے الفاظ و معانی کو اپنا دوست بنایا۔ فن پر محاکمہ آسان کام نہیں۔ صلاحیت اظہار نہ ہو تو تحریر گنجلک اور مبہم ہو جاتی ہے۔ روش خاص کو اپنانا تو اور بھی مشکل کام ہے۔ فن پارہ میں توانائی اس کے تخلیقی کاموں سے آتی ہے۔ تجزیہ کی ہمہ گیری صرف شاعرانہ نہیں ہوتی، تجزیاتی مطالعہ اور تنقیدی تخلیق سے بھی ہوتی ہے۔ ناقد کا کام جان جوکھوں کا کام ہے۔ اُسے تو اس بت پوشیدہ کو تخلیقی فن پارہ سے باہر نکال لانا پڑتا ہے جو اس میں چھپا ہوتا ہے، بعینہٖ اس سنگتراش کی طرح جو چٹان کا سینہ چیر کر اس میں چھپے ہوئے مجسمہ کو نکال لاتا ہے۔ ذرا سی غلطی، غلط چوٹ مجسمہ کے تمام حسن کو تباہ کر دیتی ہے۔ یہی حال ناقد کا ہے کہ اگر اس میں مرحوم احتشام حسین صاحب کا سا توازن اور مرحوم وقار عظیم صاحب کے مزاج کی نرمی نہ ہو تو وہ کلیم الدین احمد تو ہو جائے گا، اچھا ناقد نہیں ہو سکتا، ڈاکٹر سلیم اختر نہیں ہو سکتا۔

سلیم اختر کی تحریروں میں تکرار مباحث نہ ملیں گے۔ نفسیاتی دبستان میں تحلیلی طریق کار کی بڑی اہمیت ہے۔ ان کے مطالعہ کی وسعت و فراوانی کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب وہ ادبی اختلاف کرتے ہیں۔ برادرم انتظار حسین صاحب نے افسانے ہی نہیں "چھٹے ٹوٹے" مضامین بھی لکھے ہیں۔ ملک پیرو میں لیما نام کا ایک قصبہ ہے۔ قریب ہی ایک کھائی کو عبور کرنے کے لئے ایک پل تھا۔ چھ انسان اُسے عبور کر رہے تھے۔ پل ٹوٹ گیا، پانچ انسان مر گئے۔ چھٹا ایک پادری جیو پیر تھا، وہ سستانے کے لئے ٹھہر گیا، بچ گیا۔ جیو پیر نے ان گم شدہ انسانوں کی کہانی لکھی "پل پر" ولڈر کے اس مختصر ناول کو پڑھتے ہوئے مجھے انتظار حسین یاد آتے ہیں، کہ وہ ماضی میں کھوئی ہوئی سواریوں کو تلاش کرتے ہیں اور آتش رفتہ کا سراغ لیتے پھرتے ہیں لیکن ضروری خیال کرتے ہیں کہ ترقی پسند تحریک پر خط تنسیخ پھیر دیں۔ پریم چند کی حقیقت نگاری سے بھی وہ بیزاری کا اعلان کرتے ہیں۔ کرشن، عصمت، منٹو اور احمد ندیم قاسمی پر سنگ زنی کی انتہا کر دیتے ہیں، تو سلیم اختر جو کبھی ترقی پسند نہیں رہے اس تحریک کا دفاع کرتے ہیں۔ کہ انتظار صاحب کو ادب میں تحریکوں سے بھی نفرت ہے۔ سلیم اختر افسانے کے کرداروں کو کبوتروں کی مانند کابکوں میں تقسیم کر دینا درست نہیں خیال کرتے۔ کھوئے ہوؤں کی تلاش ضرور کیجئے مگر کسی کی گردن مار کر نہیں کہ پھر اس کی تلاش میں کسی کو نہ نکلنا پڑے۔ سلیم اختر بتاتے ہیں کہ زندگی محض موج نغمہ نہیں، محض ٹوٹے گل بھی نہیں، کچھ اور بھی ہے۔ آج تک مچھلیوں کی اور پودوں کی اقسام کی صحیح تعداد نہیں معلوم کی جا سکی، زندگی کے بھی اتنے رخ ہیں کہ انھیں شمار نہیں کیا جا سکا۔ کھوئے ہوؤں کی تلاش میں بھی ایک رخ ہے۔ ایک رخ وہ بھی ہے جو گرد آلود ہے، خون اور پیپ میں لتھڑا ہوا ہے، بدبو اور سڑاند سے بھرا ہوا ہے۔ اگر ترقی پسند افسانہ نے یہ آئینہ انسان کے ہاتھ میں تھما دیا تو کیا برا کیا۔ رسم مروت اپنی جگہ، نوید انقلاب اپنی جگہ۔ ادائے شیریں ضرور معتبر ہو جائے لیکن طلسم شب کا پردہ چاک ہونا بھی ضروری ہے۔ کسی کا نغمہ عہد آفریں ضرور ہو لیکن شہری زندگی کا تصنع آمیز ماحول جو غلاظت پھیلاتا ہے وہ بھی انکشاف حقیقت ہے۔ کسی کا مائل گفتار ہونا اہمیت کا حامل سہی مگر جو

رسن و دار کی باتیں کرتا ہے وہ بے راہ روی کا شکار تو نہیں ہے۔ کوئی محرم اسرار ہو ضرور ہو مگر ناوک اندازی تو نہ کرے۔ فکر و نظر سے عاری دانشور کہلائیں اور معیار کا پیمانہ جاننے والے اس پستی پر چپ رہیں، تو کوئی تو ہو جو ٹوکنے والا ہو۔ وہ لوگ جو غلط ماخذ کی بنیاد پر عنوان قائم کرتے ہیں کوئی تو ان کا پردہ چاک کرے۔ بس یہی کچھ بھی فرق سلیم اختر بتاتے ہیں کیسا اور کتنا بڑا فرق و تفاوت۔ زندگی کی یہی غیر منقسم وحدت و کلیت ہے جو کرشن، منٹو، عصمت، احمد ندیم قاسمی افسانوں میں پیش کرتے ہیں۔ زندگی کی بے پایاں وسعت کا اندازہ کرنے کے لئے چشم بینا کا ہونا ہی کافی نہیں، اُسے وا بھی ہونا چاہیئے۔ جنون عشق اور تیشۂ فرہاد ساتھ ساتھ چلیں مگر پیرہن تار تار اور دست بریدہ لوگوں کے حال کے بغیر اردو افسانہ ہی کیا ادب کی ہر صنفِ سخن بے معنی ہے۔ سلیم اختر نے نجی معاملات اور شخصی روابط کو قائم بھی رکھا اور جاندار اختلاف بھی کیا، اسی لئے میری رائے یہ ہے کہ وہ تقلید و رسم پرستی سے اجتناب کرتے ہیں۔ سکون نا آشنا دل نہیں رکھتے اور نہ ان کا ذہن مضطرب ہے۔ اعتماد مزاج و طبیعت میں انتشار و اختلال نہیں سکون ہے۔ عمیق ترین قلبی کیفیات کی پہچان ناقد کے فرائض میں شامل ہے اور یہ لطافتِ ذوق اور رعنائی تخیل کے بغیر کب ہو سکتا۔

انتظار صاحب کو اردو ادب میں کسی صوفی کا انتظار ہے۔ انگریزی ادب میں دو بڑے صوفی گزرے ہیں۔ ایک شاعر، دوسرا افسانہ نگار و ناول نگار۔ ورڈز ورتھ جب فرانس پہنچا تو جس گھر میں مہمان رہا اسی گھر کی ایک لڑکی اینیتے ویلاں سے ناجائز تعلق قائم کیا۔ جب لڑکی کی پیدائش ہوئی تو اینیتے ویلاں سے جھوٹ بول کر پھر جلد آؤں گا انگلستان چلا گیا اور حقیقی ماں جائی بہن کے عشق میں گرفتار ہو گیا۔ یہ صوفی شاعر تھا، فطرت کا پجاری کہلایا   ڈی ایچ لارنس نامرد تھا پھر بھی فریدہ سے شادی کی۔ مڈلٹن مرے نے فریدہ سے ناجائز تعلق پیدا کر لیا   لارنس بھی صوفی تھا۔ بلاشبہ ورڈز ورتھ بڑا شاعر اور لارنس بہت بڑا ناول نگار ہے۔ ممکن ہے انتظار صاحب کو ایسا صوفی ملے جو ایسی آلائشوں سے پاک ہو، مگر سلیم اختر بتاتے ہیں کہ ترقی پسند افسانہ نگار صوفیوں کے حالاتِ زندگی ضرور لکھے گا، کہ وہ تو ہوتا ہی حقیقت نگار ہے۔ انتظار صاحب کو کون سمجھائے کہ ترقی پسند افسانہ نگار تو نظیر اکبرآبادی کے آدمی نامہ کی توضیح کرتے رہے ہیں۔ اس کا کلام اگر سوختنی نہیں تو یہ لائق گردن زدنی کیونکر ہوئے۔

سلیم اختر، بیوی کو دوست کہنے اور سمجھنے والے اس کی دلداری کے لئے لاہور چلے گئے۔ لاہور میں کوئی ادبی مقام بنا لے بڑا مشکل کام ہے۔ اب تو یہ حال ہو گیا ہے کہ بقول مسعود اشعر "اصغر ندیم سید فاتحِ لاہور ہے"۔ یہ علامتوں کے زوال کا زمانہ ہے مگر اسی شہر میں انتظار حسین اردو افسانے کی شناخت بنے حالانکہ وہ صرف قیوما کی دوکان سے کر آئے تھے۔ سید سجاد باقر رضوی جب ۱۹۵۰ء میں مرحوم حمید احمد خان کی خواہش اور استاد محترم حسن عسکری صاحب مرحوم کے ایما پر لاہور پہنچے تو وہ ۱۸۵۷ء کے گم شدہ سپاہی نہیں تھے۔ وہ غزل میں نرم لہجہ کی روایت کے شاعر تھے۔ میر کی شاعری کا دریائے شیریں ہے۔ ہر میٹھی آواز کی صوت میر کی شاعری سے آتی ہے۔ ناصر کاظمی زندہ تھے کس کا چراغ جلتا باقر صاحب نے مقام ہی نہیں بنایا لوہا منوایا۔ سلیم اختر تو بے حد محنتی انسان ہیں۔ یہی محنت، فکری اور حسّی عناصر کی پہچان۔ ان کے منفرد ذہن کی منفرد تخلیقات نے انہیں وہ مقام عطا کیا کہ جہاں لوگ پتھر پھینکتے ہیں۔ ہر کوتاہ قد نے دراز قد پر پتھر پھینکے ہیں۔ اپنا قد بڑھانے کے لئے دوسروں کی گردن مارنا ضروری خیال کیا جاتا ہے، لیکن وقت ثابت کرتا ہے کہ کھرا کون اور کھوٹا کون۔ ذوق کی حیثیت کیا اور غالب کی عظمت کیا۔

سلیم نے کبھی گروہ بندی میں حصہ نہیں لیا۔ ہمیشہ سلیقہ سے کام کیا۔ بیوی نے فرسٹ ڈویژن میں ایم اے کر لیا۔ خود پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا، لاہور کے ادبی حلقوں میں نام پیدا کیا اور پھر ان کی شہرت بوئے گل کی مانند پورے برصغیر میں پھیلی۔

ایک دن خط آیا۔ ڈاک کی مہر بتاتی تھی کہ لاہور سے آیا ہے۔ تاریخ ندارد۔ دستخط پڑھے جائیں نہ خط کا مضمون سمجھ میں آئے۔ خیال آیا شاید یہ اردو زبان میں نہیں لکھا گیا۔ پھر کس زبان میں ہے اور لکھنے والا کون ہے۔ اسلم انصاری ہر خط کو پڑھ لیتے ہیں۔ اُن سے رجوع کیا، تب معلوم ہوا کہ سلیم اختر صاحب کا خط ہے۔ میں نے جواب لکھا اور درخواست کی کہ بھائی خط لکھ کر کسی سے نقل کرا دیا کیجئے۔ مگر یہ

درخواست نامنظور ہوئی۔ آج تک خطوط اسی شان سے آتے ہیں۔ مجال ہے جو وہ خط پر تاریخ لکھیں۔ کون جانے یونگ، اڈلر یا فرائڈ نے کہیں لکھ دیا ہو کہ تاریخ لکھو گے تو نفسیاتی مسائل پیدا ہوں گے۔ سلیم صاحب نے ساری زندگی اساتذہ کے حکم سے روگردانی نہیں کی، اب آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے۔ حیرت ہے پچیس کتابیں اسی خط میں لکھی گئی ہیں۔ اس سے زیادہ حیرت اس امر پر ہے کہ کاتب یا کاتبوں کو کوئی بڑا انعام کیوں نہیں دیا گیا۔ ہم تو ہاکی کے کھلاڑی کو پچیس لاکھ روپیہ دیتے ہیں لیکن کاتب؟ ایسی باتوں سے انتظار صاحب ناراض ہوتے ہیں۔

لاہور میں ایک شخص آہستہ آہستہ سائیکل چلا رہا تھا۔ سائیکل مرزا کی سائیکل سے کم نہ تھی۔ روشنیوں کے اس شہر نے سلیم اختر کے رنگ کو سنولا دیا تھا۔ آنکھوں کے نیچے حلقے، قمیص اور پتلون میلے، ٹائی غائب۔ کھل کر قہقہہ تو وہ کبھی نہیں لگاتے لیکن مسکرانا بھی بھول گئے تھے۔ سنجیدگی اور تفکرات نے بوڑھا کر دیا تھا۔ ایک مکان سے دوسرے مکان میں منتقل ہوتے رہے۔ بیگم سلیم نے اعلان کیا "لاہور میں رہنا ہے تو مکان بنے گا ورنہ چلو چیچو کی ملیاں"۔ میاں بیوی دونوں مقروض ہو گئے، مگر مکان بنا لیا۔ اسکوٹر خریدا پھر فروخت کر دیا۔ وہی مرزا کی سائیکل اور کالج، بیہوش ہوتے، بیمار ہوتے، مرتے مرتے بچے۔ میں ایک دن "الجودت" پہنچ گیا۔ بڑی طمانیت تھی ان کے چہرہ پر۔ مجھے ان کی خوش قسمتی پر، ان کے پڑوسی دیکھ کر رشک آیا۔ الکمال میں ایک باکمال آرٹسٹ رہتا ہے۔ مصوری میں اپنے اسلوب کا موجد بھی، خاتم بھی۔ بڑے زوردار قہقہے لگاتا ہے۔ اپنے فن میں منفرد۔ وہی کمال جو حدیث پر عمل کرتا ہے، چین تک ہو آیا ہے۔ جو چھوٹی چھوٹی وعدہ خلافیاں کرتا ہے مگر بڑا ہی پیارا انسان ہے۔ دوسرے پڑوسی محمود بھائی ہیں، صوم و صلوٰۃ کے پابند، اہلِ دل کہ دل کے مریض ہیں۔ کبھی روحِ ادب نکالتے تھے، سارے جہان میں گھومتے تھے، چور پکڑنے کے ماہر اور محمد نقوش کے دوست۔ عصمت آپا نے ایک لڑکی کی زبان سے کہلوایا ہے "ایسے ملیں تو دو کروں" محمود عالم قریشی اتنے شریف ہیں، اتنے اچھے ہیں کہ ایسے انسان اگر عام ہو جائیں تو بیویاں ایسے ایسے دو کریں اور تاحیات حرفِ شکایت زبان پر نہ لائیں۔

لاہور تو پیدل گھوم کر دیکھنے کا شہر ہے۔ اب یہاں زندگی کی تیز رفتاری دیکھ کر ہول آتا ہے۔ فاصلے بہت بڑھ گئے ہیں لیکن سلیم اختر سائیکل نہیں چھوڑ سکتے۔ کیسی مجبوری ہے۔ وہ کھلاڑی جو صفر پر آؤٹ ہو جاتا ہے گیارہ ہزار پاتا ہے۔ مگر ادیب مقروض ہو جائے، بیمار ہو جائے، معاشرہ پروا نہیں کرتا۔

پورا ملک ایک وبا کی لپیٹ میں ہے۔ کتاب چھپی تو اس کی تقریب رونمائی بھی ہو گی۔ کبھی دلہن کی رونمائی ہوتی تھی لیکن جب سے دلہن بے پردہ ہوئی، منہ کھولے، دیدے پھاڑے مردوں کے بیچ آ بیٹھی، کتابوں کی رونمائی شہر شہر ہوتی ہے۔ صاحب کتاب کے ساتھ ناقدوں کے غول چلتے ہیں۔ تقریباتی تنقید نے خود رو گھاس کی طرح جنم لیا ہے۔ اس گھاس کو جتنا کاٹا جاتا ہے اتنی ہی پھیلتی ہے۔ شاعر ہے تو میر سے بڑا اور افسانہ نگار ہے تو عصمت، کرشن، منٹو، احمد ندیم قاسمی تو کس گنتی میں ہیں کہ اردو کے افسانہ نگار ہیں۔ کسی نے کرم کیا تو سمرسٹ ماہم تک پہنچا ورنہ ڈی ایچ لارنس سے بڑا افسانہ نگار ہوا۔ نہ خود شرمسار ہوتا ہے نہ اس کا ناقد۔ سلیم اختر بڑے مروت والے انسان ہیں۔ کوئی بلائے تو انکار نہ کریں گے۔ طاہر تونسوی کا خیال ہے کہ ایسے مواقع پر جملے بازی بھی کر لیتے ہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ بازی کوئی ہو اس کے لئے بڑے دل گردہ کی ضرورت ہوتی ہے، بڑی مہارت، ذہن کی دراکی، اساتذۂ فن کی مدد اور نہ جانے کس چیز کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب ہر شخص ممتاز مفتی یا اشفاق احمد تو ہو نہیں سکتا۔ ہاں طاہر کی یہ بات درست ہے کہ سلیم صاحب کا ظاہر و باطن ایک ہے۔ منافقت کرنا انھیں آتا ہی نہیں۔ بچپن ہی سے تنہائی پسند ہیں اور تخیل پسند، اور اسی لئے ترقی پسند نہیں ہو سکے کہ وہ حقیقت پسند ہوتا ہے۔ مطالعہ کی چاٹ پڑ جائے اور وہ بھی بچپن سے تو ایسا شخص گروہ سے بھاگتا ہے۔ شگفتہ مزاجی تو ممکن ہے لیکن زندہ دلی ایسے لوگوں سے دور بھاگتی ہے۔

ذرا خیال فرمائیے، سلیم صاحب نے آٹھویں جماعت میں دو افسانے لکھے۔ میٹرک میں پہنچے تو ایک مجموعہ، ایک طوائف اور کچھ تتلی تک کو پہچان گئے۔ احساسِ تحیر بڑھا تو نفسیات کا دامن تھام لیا۔ نئی معنویت ملی اور زندگی کے تجربات و مشاہدات میں اضافہ ہوا۔

تو ایک ہی جست میں بلندی پر پہنچے۔ اور یہ وہ مقام ہے جب افسانہ نگار کا مشاہدہ انکشاف کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ بچپن سے جوانی تک عالم خیال کی رنگینی و رعنائی کی فضا میں اسی وقت کھنچ گئیں جب نفسیات کے عمیق مطالعے نے انکشاف حقیقت کیا کہ خلاقانہ قوت کا سرچشمہ تو تاریکی میں پوشیدہ ہے۔ دن کی روشنی تو شب کی سیاہی سے پھوٹتی ہے۔ جذبہ و فکر کے اظہار پر پابندیاں نہ ہوں تو یہ قوت کرشمہ بن جاتی ہے۔ اور پابندیاں ہوں تو انسان سے ایسے اعمال سرزد ہوتے ہیں جہاں اخلاقی تصورات ہی نہیں عام اخلاقی باتیں بھی ڈھیر ہو جاتی ہیں۔ نتیجہ ظاہر ہے، تحقیق و تاویل مشکل ہو جاتی ہے تشریح و تفسیر مشکل تر۔

سلیم اختر تو اضح ضرور کریں گے، اتنی ہی جتنی ان کی جیب اجازت دے۔ چائے نہایت شوق سے پیتے ہیں اور ہر سچے مسلمان کی طرح گوشت نہایت رغبت سے کھاتے ہیں۔ پراٹھوں کے ساتھ اگر آم کا اچار کھالیں تو دن بھر سوتے ہیں۔ قیلولہ ان کے لئے فرض کا درجہ رکھتا ہے۔ رات کو دیر تک جاگتے اور تخلیقی کام کرتے ہیں۔ اگر کام نہ ہو تو بیوی سے علمی مباحثہ کرتے ہیں۔ دوستوں کی خیر خبر لینے ضرور جاتے ہیں اور یہ توقع نہیں کرتے کہ کوئی اُن سے ملنے آئے گا۔ بے ضرورت اور بے محل نہ گفتگو کرتے ہیں نہ کرنے دیتے ہیں کہ راحت و عافیت اسی میں پاتے ہیں۔ مخالفت جتنی تند و تلخ ہو گی یہ اتنے ہی پُرسکون ہوں گے کہ شرافت جسے کہتے ہیں وہ سلیم اختر کے وجود میں مجسم ہو گئی ہے۔

مشکور حسین یاد

مردِ کم گو بسیار توفیق

ڈاکٹر سلیم اختر سے میری پہلی ملاقات اسی وقت ہوئی جب وہ گورنمنٹ لاہور کے شعبہ اردو میں تبدیل ہو کر آئے۔ اس سے پہلے میں نے اُن کے کچھ مضامین پڑھ رکھے تھے لیکن یہ مجھے آج تک معلوم نہ ہو سکا کہ میرے ذہن میں ڈاکٹر صاحب کے بارے میں یہ خیال کس نے بٹھا دیا تھا کہ وہ کسی زمانے میں ایک بھرپور عاشق رہ چکے ہیں۔ بھرپور عاشق سے میری مراد اردو غزل کا روایتی عاشق ہے جو ہر وقت محبوب کے تصوّر میں محو رہتا ہے۔ نہ اُسے کھانے کا ہوش ہوتا ہے نہ پینے کا۔ بس ہر دم محبوبہ محبوبہ پکارتا رہتا ہے۔ اُٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، سوتے جاگتے لیلیٰ لیلیٰ کی صدا لگانے کے علاوہ اُسے اور کوئی کام نہیں ہوتا ——— مگر جیسے ہی میں نے انھیں پہلی بار دیکھا تو مجھے ڈاکٹر صاحب کی ذات میں اُس عاشق کا دُور دُور تک کہیں نام و نشان تک نظر نہ آیا۔ ——— وحشت تیرے کی ——— یہ شخص تو ہم ایسا عام انسان نکلا، بلکہ ایک اعتبار سے ہم سے بھی گیا گذرا کہ ہم تو پھر بھی اپنی روزانہ کی بول چال میں ایک اُودھم سا مچائے رکھتے ہیں اور ڈاکٹر سلیم اختر ہے کہ خاموشی سے آیا اور خاموشی سے چلا گیا۔ کسی نے کوئی بات پوچھی تو جواب دے دیا ورنہ بلا وجہ ایک لفظ بھی زبان سے باہر آئے تو قسم ہے۔ اِدھر میں اس قدر فضول آدمی واقع ہوا ہوں کہ اس طرح کے گُم سُم شخص کے ساتھ ایک لمحہ بھی نہیں گزار سکتا۔ میں نے پہلے روز ہی اپنی عادت کے مطابق انھیں گدگدا ڈالا ——— اور اپنے اس تجربے کے بعد محسوس کیا کہ ہزار خاموشی کے باوجود یہ شخص خشک یا خفا نہیں ہے۔ مطلب یہ کہ اس شخص کے ساتھ اپنا گذارا ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ہمارے روابط ابھی ابتدائی منازل میں تھے کہ ہم نے اُن سے یہ بھی شکایت کر دی کہ حضرت آپ نے اپنی مختصر تاریخ ادبِ اردو میں انشائیہ کے حوالے سے ہمارا ذکر کیوں نہیں کیا۔ پتہ چلا کہ اس میں ہماری اپنی کوتاہی تھی۔ ہم نے انھیں اپنی کتابیں کیوں نہ بھجوائیں ——— اور جب ڈاکٹر صاحب کو معلوم ہوا کہ ہم نصف درجن کتابوں کے مصنف بھی ہیں تو بڑے افسوس اور تعجب کے ساتھ کہنے لگے "یار اتنی کتابوں کے مصنف ہونے کے باوجود ادبی حلقوں میں تمھارا ذکر زور شور سے کیوں نہیں ہوتا"۔ اب ڈاکٹر صاحب کو کیا بتاتے کہ ہم کس قماش کے آدمی ہیں۔ ہمارے خیال میں کسی مصنف کا کام تصنیف کرنا ہے نا کہ اس کی پبلسٹی بھی وہ خود ہی کرتا پھرے۔ تعلقاتِ عامہ قائم کرنے کے اعتبار سے ہم خاصے ناکارہ آدمی ہیں۔ مگر دوستوں کی ستم ظریفی دیکھئے کہ اگر ہم کہیں ذرا بھی آنکھ کھول لیتے ہیں تو ہم پر چالاک اور ہوشیار ہونے کا الزام فوراً تھوپ دیا جاتا ہے۔ ہم پر اِس طرح کا الزام تھوپنے میں ہمارے محترم دوست پروفیسر مرزا محمد منوّر بہت پیش پیش رہتے ہیں۔ کوئی اُن سے پوچھے حضرت! ذرا انصاف سے بتایئے مشکور حسین یاد کن کن محفلوں میں شریک ہوتا ہے۔ کہاں کہاں تقریریں کرتا ہے۔ ریڈیو، ٹی وی پر کون آئے دن گُل افشانیٔ گفتار کے جوہر دکھاتا ہے ——— اور پھر ماشاء اللہ ہمارے مرزا صاحب دردِشِ زمانہ بھی مشہور ہیں۔ اس واقعہ کو یہاں بیان کرنے سے میرا مطلب یہ ہے کہ ڈاکٹر سلیم اختر اپنے

وقت کا درویش نہیں ہے۔ وہ جو کام کرتا ہے کہہ کر کرتا ہے اور پھر اس کی توجیہہ نہیں کرتا۔ یعنی اُسے اِس طرح کا کوئی کامپلیکس نہیں کہ اپنی آنکھ کا شہتیر تو نظر نہ آئے اور دوسرے کی آنکھ کا تنکا بھی شہتیر دکھائی دے۔ وہ اپنے آپ کو ایک عام انسان سمجھتا ہے۔ جس سے غلطیاں بھی ہو سکتی ہیں اور جسے زمانے کی کچھ ضرورتیں بھی ہوتی ہیں۔

میں جہاں کسی کی جائز اور حقیقی تعریف کرنے سے باز نہیں آتا وہاں مجھ میں ایک عیب بھی ہے کہ میں کسی کی سچی بُرائی کو بھی کہے بغیر نہیں رہتا۔ میں سمجھتا ہوں یہ بات میری بداخلاقی کو ظاہر کرتی ہے۔ اوّل تو ویسے ہی کسی کی بُرائی کرنا، خواہ وہ حقیقت پر مبنی کیوں نہ ہو، اچھی بات نہیں۔ دوسرے اس شخص کی غیر حاضری میں بُرائی کرنا تو اور بھی بُری بات ہے، لیکن میں عموماً ایسا کر جاتا ہوں۔ میں نے دیکھا کہ ڈاکٹر سلیم اختر ایسا نہیں کرتے۔ اوّل تو کسی کی غیر حاضری یا حاضری میں بُرائی کرتے ہی نہیں ہیں، اور اگر کرتے ہیں تو پھر اُس کے سامنے بھی اور علی الاعلان بھی۔ مثال کے طور پر ڈاکٹر وزیر آغا کے پہلے وہ دوست تھے لیکن جب ان کی طرف سے اور اُن کے حواریوں کی طرف سے خواہ مخواہ انھیں بُرا بھلا کہا گیا تو پھر ڈاکٹر سلیم اختر نے بھی اُن لوگوں کا ڈٹ کر جواب دینا شروع کر دیا۔ بیگم سلیم اختر سے دورانِ گفتگو معلوم ہوا کہ اوّل تو ڈاکٹر صاحب گھر والوں سے ناراض نہیں ہوتے لیکن جب انھیں غصہ آتا ہے تو پھر بُری طرح سے آتا ہے ــــ اگلی پچھلی رہی سہی سب کسر نکل جاتی ہے۔ دراصل صلح کل اور صلح جو شخص شریف تو ہوتا ہے لیکن کمزور نہیں ہوتا۔ فی زمانہ ایک اور بڑی قباحت یہ ہے کہ ہم ایسے صلح کل قسم کے انسان کو اچھا سمجھنے کے بجائے یہ سمجھتے ہیں کہ یہ کوئی موقع پرست انسان ہے یعنی سب سے بنا کر رکھنے والے کو ہم معاشرے کا کوئی زیادہ مضبوط فرد نہیں سمجھتے۔ یہ سب ہماری بے یقینی ہے ورنہ سب سے بنا کر رکھنے والے انسان کو اپنے آپ پر بڑا قابو رکھنا پڑتا ہے۔ ممکن ہے بہت سے لوگوں کو ڈاکٹر سلیم اختر کے کردار کی یہ خوبی بھی بُرائی نظر آتی ہو۔ لیکن اس کی صحیح معنی میں حقیقت اسی وقت کھلتی ہے جب ڈاکٹر صاحب سے ہمارا واسطہ پڑتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آج کل دوست بننے کی نسبت کسی کا دشمن بننا زیادہ مشکل کام ہے کیونکہ ہم لوگوں میں اتنی جرأت ہی نہیں رہی ہے کہ اپنی کسی حق بات پر ڈٹ سکتے ہوں لیکن ہم نے دیکھا ہے کہ ڈاکٹر سلیم اختر اپنی شخصیت کی تمام تر نرمی اور سلامتی کے باوصف کسی بات پر اختلاف کرنے پر آتے ہیں تو اختلاف کرنے کی ہمت بھی رکھتے ہیں۔ مگر ظاہر ہے، چھوٹی چھوٹی باتوں پر جھگڑا مول لینا کہاں کی عقلمندی ہے۔ اس کے علاوہ جس شخص کے سامنے کوئی مقصد ہوتا ہے اُس کے لئے بہتر یہی ہے کہ وہ اپنی عام زندگی کو غیر اہم نوعیت کے تنازعات سے پاک و پاکیزہ رکھے۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب کا عمومی رویہ بھی کچھ اسی طرح کا مصالحانہ قسم کا ہے۔ وہ نیچی نگاہ کر کے چلنے کے عادی ہیں۔ جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ وہ خواہ مخواہ اُلجھنے سے حتی الوسع گریز کرتے ہیں۔ آ بیل مجھے مار، نہیں مارتا تو تب بھی مار، قسم کی ضرب المثل کا اُن کی زندگی میں کوئی عمل دخل نہیں۔ بیل کو خواہ مخواہ دعوتِ مبارزت دینا تو بڑی بات ہے ڈاکٹر صاحب تو بیل کا نام سُننا بھی پسند نہیں کرتے۔ لیکن اِس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اگر بیل انھیں سینگ دکھانے پر آتا ہے تو وہ اُس سے گریز کر جاتے ہیں۔ حسبِ موقع بیل سے نبرد آزما ہونے کی بھی اُن میں سکت پائی جاتی ہے۔

ایک مشہور حدیث ہے کہ اگر تمھیں کسی کے سچّے کردار کو دیکھنا مقصود ہے تو اُسے اُس شخص کے گھر میں جا کر دیکھو۔ انسان کے کردار کا آئینہ اس کا گھر ہوتا ہے۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کی بیگم اور بچّوں سے باقاعدہ گفتگو کی ہے۔ بیگم کا کہنا ہے کہ وہ بڑی سادہ زندگی گزارتے ہیں۔ سادہ زندگی سے مراد یہ ہے کہ کھانے پہننے میں کسی خاص اہتمام کے قائل نہیں، جو مل گیا وہ کھا لیا، جو میسر آیا وہ پہن لیا۔ بیگم ہی اُن کے لباس کے لئے کپڑے خرید کر لاتی ہیں اور گھر میں جو کچھ پکا کر ان کے سامنے رکھ دیا جاتا ہے وہ اسے کسی حیل و حجّت کے بغیر کھا لیتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی اس بات پر مجھے اپنے چھوٹے پن کا بے حد خیال آیا۔ ایک میں ہوں کہ کھانا کھاتے وقت بھی اس میں سو خرابیاں نکالنے بیٹھ جاتا ہوں، اور اسی طرح لباس پہنتے وقت بھی ہزاروں طرح کے دکھاتا ہوں ــــ آپس میں ان میاں بیوی کے اعتماد کی یہ حالت ہے کہ جب میں نے ازراہ مذاق بیگم سلیم اختر سے پوچھا "بھابی آپ نے کبھی ڈاکٹر صاحب کی کوئی چیز چرائی ہے یا اسی طرح ڈاکٹر صاحب نے آپ کی کوئی چیز چرائی؟" تو انھوں نے ہنس کر جواب دیا "بھائی صاحب کسی چیز کا چرانا

تو بڑی بات ہے، ہم تو آپس میں ایک دوسرے سے اپنے دل کی باتیں تک نہیں چھپاتے"۔ ڈاکٹر صاحب کی بیٹی سائکی سے میں نے پوچھا "بیٹا! تمھارے ساتھ تمھارے ابو کا رویہ کیسا ہے"

اس نے بے ساختہ جواب دیا "انکل! بہت ہی پیارا، بہت ہی آزادانہ ــــ وہ ہمیں خواہ مخواہ کبھی نہیں ٹوکتے۔ ہم بچے ہر ممکن حد تک اپنے گھر میں آزاد فضا میں سانس لیتے ہیں ــــ امی تو ہمیں کبھی ٹوک بھی دیتی ہیں۔ اس ضمن میں ابو کا تو کوئی جواب ہی نہیں"

یہ سچ ہے مجھے یہاں پھر اپنے کمتر ہونے کا بُری طرح احساس ہوا۔ میں اگر بات بات پر بچوں کو نہیں ٹوکتا تو سچی بات یہ ہے کہ میں نے انھیں کوئی خاص آزادی بھی نہیں دے رکھی ہے۔ ماشاء اللہ بچے جوان ہوگئے ہیں لیکن اب بھی انھیں بات بے بات ڈانٹ ڈپٹ پڑ جاتی ہے، اور یہ غریب اپنے نااہل باپ کی ڈانٹ چُپ چاپ سر جھکا کر برداشت کر لیتے ہیں۔ ایسی واقعات کے پیشِ نظر میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ ہم لوگ خواہ مخواہ اپنی کہنہ عمری کے باعث اپنی نسل کو اچھا کہتے ہیں ورنہ ہمارے بچے یعنی ہماری موجودہ نسل ہم سے کہیں زیادہ بہتر ہے ــــ میں نہیں کہہ سکتا ڈاکٹر سلیم اختر نے میٹرک میں اتنے نمبر لئے ہوں جتنے نمبر اُن کے بیٹے اور بیٹی نے لئے ہیں۔ کم از کم میں اپنے بارے میں کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اتنے نمبر کبھی نہیں لئے جتنے میرے بیٹے اور بیٹیاں اپنے امتحانات میں لیتے رہے ہیں۔ اسکول کالج کا ایسا ریکارڈ تو سیکنڈ ڈویژن سے کبھی آگے نہ بڑھا اور بچے وظیفے لئے بغیر باز نہ آئے۔ یہاں اپنے یا ڈاکٹر سلیم اختر کے بچوں کی تعریف مقصود نہیں، آج کی پوری موجودہ نسل کی تعریف مقصود ہے۔ ہاں اس موجودہ ذہین نسل کی تعریف، جس کو بصیرت افروز اور جاندار رہنمائی تا حال نصیب نہ ہو سکی۔ البتہ ہم موجودہ نسل کے بارے میں بڑبڑاتے ضرور رہتے ہیں۔

میں نے ڈاکٹر صاحب کے معمولاتِ زندگی دریافت کرتے ہوئے بیگم سلیم اختر سے جب یہ پوچھا کہ وہ صبح کو کس وقت اُٹھتے ہیں تو انھوں نے مسکرا کر جواب دیا "صبح کو اٹھنا ڈاکٹر صاحب کے لئے ایک مسئلہ ہے"

"تو کیا آپ اُن کو کان پکڑ کر اٹھاتی ہیں"

"ہائے ہائے بھائی جان ایسی کوئی بات نہیں۔ غریب رات کو دیر تک جاگ کر لکھنے پڑھنے کا کام کرتے ہیں۔ صبح جلدی کیسے اٹھ سکتے ہیں"

میں نے پھر اپنی دانست میں ازراہِ مذاق ایک سوال کیا "کیا آپ نے ڈاکٹر صاحب کو کبھی گاتے ہوئے سُنا ہے۔ غالباً غسل خانے ہی میں راگ الاپتے ہوں گے"

وہ فوراً بولیں "نہیں منشور بھائی! شاید آپ کو یہ سُن کر تعجب ہو کہ ڈاکٹر صاحب تو باقاعدہ گانے رہے ہیں"

"آجکل بھی گاتے ہیں؟"

"آجکل تو ان کی کتابیں گاتی ہیں یا دوسرے الفاظ میں آجکل یہ اپنی تحریروں میں گاتے ہیں"

"اب انھوں نے گانا کیوں چھوڑ دیا ہے؟"

"اس وجہ سے کہ لکھنا جو شروع کر دیا ہے"

لکھنے لکھانے کے سوال و جواب پر مجھے ڈاکٹر صاحب کے ہینڈ رائٹنگ (HAND WRITING) کا خیال آگیا۔ چنانچہ بیگم سلیم اختر صاحبہ سے پوچھا۔ "بھابی! آپ کے شوہر کا خط اس قدر خوبصورت کیوں ہے؟"

بے اختیار ہنس کر بولیں: "منشور بھائی ممکن ہے آپ اس بات پر بھی حیرت کا اظہار کریں لیکن امرِ واقعہ یہی ہے کہ ابتدا میں جب ڈاکٹر صاحب نے مجھے پہلا خط لکھا اس وقت اُن کا ہینڈ رائٹنگ اتنا خراب نہ تھا۔ اُن کی توجیہ جیسے جیسے عمر بڑھتی جا رہی ہے اتنا ہی ہینڈ رائٹنگ روز بروز خراب ہوتا جا رہا ہے۔ حالانکہ مشق کے باعث ہونا چاہئیے تھا بہتر سے بہتر۔"

میں نے بھابی سے پھر ایک شریر سا سوال کر ڈالا "آپ کو ڈاکٹر صاحب بہ حیثیت ادیب اچھے لگتے ہیں یا بہ حیثیت شوہر؟"

کہنے لگیں: "دونوں صورتوں ہی میں اچھے لگتے ہیں۔ ویسے اُن کا موڈ اس وقت دیکھنے کے قابل ہوتا ہے۔ جب یہ کسی ادبی محفل سے ہو کر گھر لوٹتے ہیں۔"

"گویا اُس وقت ڈاکٹر صاحب فارم میں ہوتے ہیں۔ پھر تو وہ بہ حیثیت شوہر بھی فارم میں ہوتے ہوں گے۔"

بیگم سلیم اختر میرے اس سوال کا جواب گول کر گئیں، یا یوں سمجھئے اس وقت مجھے اُن کا جواب یاد نہیں آرہا ہے۔ بہرحال اُن کی خاموشی پر مجھے ایک سوال یاد آیا۔ "ڈاکٹر صاحب کا تکیہ کلام کیا ہے؟"

ایک دم گویا چونک کر بولیں۔ "وہ بولتے ہی کم ہیں۔ ایسا آدمی جو گنتی کے لفظ زبان سے نکالتا ہو اُس کا تکیہ کلام کیا ہو سکتا ہے۔"

"کہیں آپ کے زیادہ بولنے کی وجہ سے تو وہ خاموش نہیں ہو گئے۔"

"نہیں ایسا نہیں، میں کون سی پُرگو ہوں۔"

میں نے پھر ایک بے ہنگم سا سوال بیگم سلیم اختر کے سامنے رکھ دیا۔ "بھابی! آپ نے ڈاکٹر صاحب کو کسی جانور کی سواری کرتے دیکھا ہے؟"

"مثلاً؟"

"گھوڑا، گدھا، ہاتھی، اونٹ وغیرہ۔"

ایک دم ہنس کر بولیں۔ "ڈاکٹر صاحب تو دو ٹانگوں پہ چلتے ہیں یا دو ٹانگوں کی سواری پہ۔"

میں نے کہا۔ "دو ٹانگوں والی بات تو سمجھ میں آگئی یعنی ڈاکٹر صاحب پیدل بہت چلتے ہیں لیکن دو ٹانگوں کی سواری سے آپ کا کیا مطلب ہے؟"

کہنے لگیں۔ "سائیکل"

میں نے ذرا سی تبدیلی کے ساتھ اپنا سوال پھر دہرایا۔ "بھابی آپ نے ڈاکٹر صاحب کو ہاتھی، گھوڑا، ریچھ، گدھا، اونٹ وغیرہ پر سواری کرتے تو یقیناً کبھی نہیں دیکھا۔ کیا آپ نے تصور میں یا خواب میں بھی ڈاکٹر صاحب کو اِن سواریوں پر سوار ہوتے نہیں دیکھا؟"

"آخر آپ میرے میاں کو اِن کئی ہزار سال پُرانی سواریوں پہ سوار کس لئے دیکھنا چاہتے ہیں؟"

"آپ نے ڈاکٹر صاحب کو راکٹ میں سوار ہوتے دیکھا ہے؟"

ہنس کر بولیں "اچھا تو بھائی صاحب آپ سو فی صد مذاق پر اُتر آئے ہیں۔"

میں ڈاکٹر سلیم اختر کے گھر بیٹھا اُن کی بیگم سے یہ سوال و جواب کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے تھا کہ اتنے میں ڈاکٹر صاحب بھی آگئے، آتے ہی کہنے لگے۔ "کیوں بھئی انٹرویو پورا ہو گیا یا ابھی کوئی کسر باقی ہے۔ اگر کچھ کمی ہے تو میں پھر باہر چلا جاتا ہوں۔"

میں نے کہا ایسی کوئی بات نہیں۔ آپ سامنے بھی ہوتے تو میں یہ سوالات بھابی صاحبہ سے پوچھ سکتا تھا۔ اتنے میں بیگم سلیم اختر کہنے لگیں۔ "اب آپ دونوں باتیں کریں، میں ذرا آپ کے لئے چائے کا انتظام کرتی ہوں۔" بھابی اُٹھ کر گئیں تو میں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا۔ "یار ہماری بھابی تو بہت اچھی ہیں۔"

کہنے لگے۔ "بھلے آدمی! میں نے اپنی بیوی کی بُرائی تم سے کب کی ہے؟"

میں نے کہا۔ "آپ نے اپنی بیوی کی بُرائی کی ہے اور میرے سامنے کی ہے۔"

"کب؟" ڈاکٹر صاحب نے قدرے سنجیدہ ہو کر پوچھا۔

"اکثر۔"

"یار کیا فضول بات کرتے ہو۔"

میں نے کہا: "دیکھو پیارے جھوٹ مت بولو۔ کیا تم نے یہ نہیں کہا کہ میری بیوی سب باتوں میں اچھی ہے مگر میری ایک بات نہیں مانتی۔"

ہنس کر بولے: "ہاں یہ تو مجھے شکایت ضرور ہے۔"

میں نے انجان بن کر پوچھا: "مگر جناب قبلہ ڈاکٹر سلیم اختر صاحب مدظلہ العالی وہ بات ہے کیا؟"

مصنوعی طور پر منہ پھلا کر یعنی ہنسی کو گلوں میں بھر کر بولے: "بکواس بند نہیں کرو گے؟"

عرض کیا: "یہ لیجئے بکواس بند کر دیتا ہوں۔"

رحیم گل

اُستادوں کا اُستاد

جودت کے ابا کا نام سلیم اختر ہے اور ہماری بہن کے میاں کا نام سلیم ہے، اور کالج کے بچّوں کو پڑھانے والے استاد کا نام ڈاکٹر سلیم اختر ہے۔

افسانے لکھتے لکھتے تنقید نگار بن گیا اور تب لوگوں کو پتہ چلا وہ بنیادی طور پر نقد و تبصرہ کا آدمی ہے۔ خصوصاً "نفسیاتی مسائل" کے سلسلے میں اُس کی رائے کو حتمی سمجھا جاتا ہے۔ انسانی سائیکی پر اُسے پورا عبور حاصل ہے۔

بال کھچڑی ہو گئے لیکن جسمانی ساخت ایسی ہے کہ تاڑ کا درخت بھی اس کی سربلندی پر رشک کرتا ہوگا۔ خوش شکل اور خوش رَد آدمی ہے لیکن بدخطی کے لئے خاصی شہرت رکھتا ہے۔ اس کے دو صفحوں کو نقل کرنے میں کاتب کو چار دن لگ جاتے ہیں۔ لیکن اُسے یہ آسانی بھی ہوتی ہے کہ نفس مضمون کو جس طرح چاہے توڑ مروڑ کر تحلیل نفسی کا مرقع بنا دے اور کریڈٹ ڈاکٹر صاحب کی جھولی میں ڈال دے یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب اپنی بدخطی کی اصلاح پر آمادہ نہیں ہوتے۔

محنتی آدمی ہے۔ رزقِ حلال کماتا ہے۔ قلم اور علم ذریعہ معاش ہے۔ مسلسل کام کرتا ہے۔ چوبیس گھنٹوں میں بیس گھنٹے مصروف گزرتے ہیں۔ دن کو کالج میں پڑھاتا ہے، شام کو ٹیوشن کا سلسلہ چلتا ہے، ادبی محفلوں میں مضامین پڑھتا ہے، ادبی حلقوں کی صدارتیں کرتا ہے۔ کتابوں کی رونمائی کی تقریبات میں مقالے پڑھتا ہے، ٹی وی ریڈیو کے مباحثوں میں شریک ہوتا ہے۔ دیباچوں کے علاوہ تقریظ بھی لکھتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب ادب میں چھیڑ چھاڑ اور نوک جھونک کے قائل ہیں۔ لیکن اُن کا وار مہذبانہ ہوتا ہے زخم نہیں لگتا، چوٹ گہری لگتی ہے۔ اور پھر زندگی کا مفہوم محض یہی تو نہیں کہ پڑھ لکھ کر شادی کر لو، نوکری کر لو، کھاؤ پیو اور جیسی موت مر جاؤ!

ادبی چونچلوں کا ایک پہلو یہ بھی تو ہے کہ جو ہے اُسے نہ مانو اور جو نہیں ہے اُسے مجسّم کر دو۔ ڈاکٹر صاحب سرگوشی کا مزاج نہیں رکھتے اور نہ گوشے میں بیٹھنے کی فطرت، ڈاکٹر صاحب اُن لوگوں میں سے ہیں کہ جس نے ہجو کی اُس کے دشمن بن گئے، وہ دشمنوں کے وار سے محفوظ ہوتے ہیں اور خود اُن کی تلملاہٹ سے بھی حظ اٹھاتے ہیں۔ البتہ معاملہ سرگودھا کا ہو تو شدّتِ احساس میں قدرے اضافہ ہو جاتا ہے، پھر لگامیں کھینچتے رہو، سرکش عربی گھوڑے کی طرح قابو میں نہیں آتے۔ اس موضوع پر اُن کی گفتگو بھی بڑی لچھے دار ہوتی ہے لیکن سارے مرحلوں میں کینہ پروری کا شائبہ تک نہیں ہوتا اور نہ چھوٹے پن کا احساس

ہوتا ہے۔ وہ نہایت سُبک لہجے میں اہلِ سرگودھا کا ذکر کرتے ہیں، سُننے والا بھی مزہ لیتا ہے اور خود بھی لطف اندوز ہوتے ہیں۔

میرا خیال ہے۔ ان کے لئے اپوزیشن بہت ضروری ہے کہ اِس سے جَولانیٔ طبع کی تحریک ہوتی ہے اور نہ صرف تخلیق کی قوت نُمو پاتی ہے بلکہ ڈاکٹر صاحب کی صحت پر بھی خوشگوار اثر پڑتا ہے۔

"دشمن کے بغیر جینا بھی کوئی جینا ہوتا ہے۔"

یہ فقرہ میں نے کسی نظم میں لکھا تھا، بہت تالیاں بجی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب اپنے قول وعمل سے اس فقرے کی روح پر پورے اُترتے ہیں۔

ڈاکٹر کو ٹھگی فریب سے دُور کا بھی واسطہ نہیں۔ صاف ستھرا اور کھرے سے کا آدمی ہے، پیدل نہیں چلتا، بیڈ روم سے باتھ روم تک سائیکل پر جانا پسند کرتے ہیں۔ سائیکل سواری میں نیک نامی کی حد تک بدنام ہیں۔ آندھی ہو یا طوفان، فاصلہ دُور کا ہو یا نزدیک کا، ڈاکٹر نے وعدہ کیا ہے تو ضرور پہنچے گا کہ وضع دار آدمی ہے، عہد و اقرار پر مرمٹنے والا! اور جب سے نئی انعامی سائیکل ملی ہے اس نے پیلی کا پیٹر کی طرح پورے لاہور کو اپنے سائے میں لیا ہوا ہے۔

بعض لوگ اُن سے حسد بھی کرتے ہیں کہ اُن کی سائیکل اتنی مشہور ہو گئی ہے۔ وہ دوست بنا کر ڈاکٹر کو موٹر سائیکل خریدنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ مگر وہ ایسے دوستوں کی باتوں میں آنے والا نہیں۔ صرف یہی نہیں ڈاکٹر تو اُن دوستوں کو بھی مایوس کرے گا جو اُسے موٹر میں بٹھانے کے خواہش مند ہیں۔ کیونکہ علامہ اقبال ٹاؤن میں مکان بنا کر انسان ساری زندگی کے لئے رہن ہو جاتا ہے۔ اور اقساط کا ایسا سلسلہ چلتا ہے کہ زندگی ختم ہو جاتی ہے اقساط ختم نہیں ہوتی۔ ڈاکٹر سلیم اختر بھی انہی شرفا میں سے ایک ہیں جنھیں لیسر اور ٹھیکیداروں نے دن میں تارے دکھائے ہیں۔ بھلا ہو بیگم سلیم اختر کا کہ آڑے وقت میں اس محنتی شخص کا ہاتھ بٹاتی رہیں، ورنہ وہ اپنی مشہورِ عالم سائیکل سے شوق نہ فرماتے بلکہ رحیم گل کی طرح ہاتھ میں لاٹھی لے کر راستہ ڈھونڈتے۔

بیگم سلیم اختر کا ذکر آیا تو کہتا چلوں کہ یہ بڑا اکنز اسٹک جوڑا ہے۔ ایک کم گو دوسرا بُرگو، ایک نرم خُو دوسرا گرم خُو، ایک متذبذب دوسرا اٹل۔ یوں زندگی آسان ہو گئی ہے کہ متانت اور سرکشی کے میل سے توازن کا چشمہ پھوٹتا ہے۔ ڈاکٹر جس طرح دوسروں کا احترام کرتا ہے لوگ، خود اُن کی بھی عزت کرتے ہیں۔

اور ہاں! اُن کی سائیکل کی طرح اُن کی ایک اور چیز بھی بہت مشہور ہے۔ اُن کا دھاریدار پاجامہ اور اُن کی بُش شرٹ، مگر ذرا محدود پیمانے پر۔ محلّے تک اور محلّے کے بازار تک یا ذرا کچھ اور آگے! جب وہ کالج سے واپس آجاتے ہیں تو فوراً ایزی ہو جاتے ہیں۔ ایزی کے معنی پاجامے کے ہیں۔ اگر اُن کے گھر پر ملاقات ہو اور ڈاکٹر پاجامے، بُش شرٹ کی بجائے کسی اور لباس میں سامنے آجائے تو فوراً دروازے سے باہر نکل جاؤ۔ کیونکہ یہ گھر ڈاکٹر سلیم اختر کا گھر نہیں ہوگا!

مشہور ہے۔ ایک دن ایک صاحب ہاتھ میں ٹوکری لئے بُش شرٹ پاجامہ پہنے بازار میں شاپنگ کر رہے تھے۔ کسی کی نظر پڑی، بولے، دیکھو دیکھو یہ شخص بھی ڈاکٹر سلیم اختر کی طرح پاجامہ پہن کر خریداری کرتا ہے۔ نزدیک آکر دیکھا تو وہ کوئی اور نہیں ڈاکٹر صاحب ہی تھے۔

ڈاکٹر صاحب نے بہت کچھ لکھا ہے اور لکھ رہے ہیں مگر اُن کی مشہور کتاب، مختصر ترین تاریخِ ادب ہے۔ جس کے اَن گنت ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ میں نے یہ کتاب نہیں پڑھی۔ مگر یار لوگ کہتے ہیں، ڈاکٹر صاحب نے اس کتاب میں ڈنڈی ماری ہے۔ ڈاکٹر صاحب اس کی تردید کرتے ہیں۔ چونکہ شریف آدمی ہیں اس لئے ہم اُن کی تردید کو آنر کرتے ہیں۔

جس طرح سائیکل اور پاجامہ ان کی کمزوری ہے اسی طرح لکھنا اُن کی شہ زوری ہے۔ میرے خیال میں ادبی رسائل میں جس تواتر سے ڈاکٹر سلیم اختر کا نام نظر آتا ہے، کم کم کسی دوسرے کا نظر آتا ہوگا۔

بات نامکمل رہے گی اگر ڈاکٹر صاحب کے شاگردِ رشید کا ذکر نہ کیا جائے۔ یوں تو ڈاکٹر صاحب کے سینکڑوں ہزاروں شاگرد ہیں۔ مگر جو اہمیت طاہر تونسوی کو حاصل ہے وہ شاید پہلی اور آخری ہو۔ وہ تمام خصوصیات جو ڈاکٹر صاحب میں پائی جاتی ہیں بدرجۂ اتم طاہر میں منتقل ہو گئی ہیں۔ یہ وراثت میں ملی خوبیاں نہیں بلکہ شعوری طور پہ اپنائی گئی ہیں۔ یہ طاہر تونسوی کی ذہانت ہے جس نے کمال خوبی سے خود کو استاد کا عکسِ جمیل ثابت کر دیا ہے۔

ہنسنا، کھیلنا، استاد کی طرح مرنجان مرنج، پبلشرز سے رشتہ رابطہ، ناشروں سے یاری دوستی، کتابوں پہ مقالوں اور تبصروں کا شوق، اور دن بھر کے پروگرام چاک آؤٹ کرنے اور اس پر عمل درآمد کی قدرِ مشترک۔ اگر میں آواگون پہ اعتقاد رکھتا تو بلا خوفِ تردید کہتا کہ ڈاکٹر سلیم اختر نے جیتے جی طاہر تونسوی کے رُوپ میں دوسرا جنم لیا ہے۔

طاہر تونسوی کی وفاداری کا یہ عالم ہے کہ وہ ڈیرہ غازی خان میں بیٹھا ہوا ہو، لکھنؤ میں ہو یا لاہور میں۔ استادِ محترم کا ذکر کسی نہ کسی حوالے سے ضرور کرے گا۔ پندرھویں صدی میں ایسا زیب کھانے والے ناپید ہیں۔ تو میں داد دوں گا استاد کو کہ کیسی استادی دکھائی، دل موہ لینے کا ایسا ڈھنگ کسی اور کو نہ سکھایا، لیکن داد دوں گا شاگرد کو بھی کہ داد و تحسین سے بے نیاز، کوئے ملامت کا پھیرا سلامت!

دونوں میں کوئی فرق ہے تو یہ، ایک اصیل مرغ کی طرح ابھارٹ اور دوسرا کابلی دُنبے کی طرح چربِ مسلّم ——— ورنہ نقل بالکل مطابقِ اصل ہے۔

●

طاہر تونسوی

اُردو دُنیا کا انوکھا سلیم اختر

لاہور والے سلیم اختر ملتان والے سلیم اختر سے قطعی طور پر مختلف ہیں اور پھر ٹمپل روڈ سے کرشن نگر اور پونچھ روڈ سے علامہ اقبال ٹاؤن شفٹ ہو جانے والے سلیم اختر اور ہی چیز ہیں ایک زمانہ تھا جب سلیم اختر ملتان رہا کرتے تھے۔ پیروں فقیروں کے اس شہر کے ایک محلے میں جسے نواں شہر کہتے ہیں ان کا مکان ایک ایسی گلی میں تھا جو بند ہو جاتی تھی ان کے سامنے والے ہمسائے نے ایک بکری "عثم نہ داری تیز بخر" کے باوجود بھی پال رکھی تھی جو ہمہ وقت سلیم اختر کے دروازے پر براجمان رہتی دودھ تو وہ خیر اپنے مالک کو ہی دیتی ہوگی مگر سلیم اختر کی چوکھٹ پر مینگنیاں ضرور چھوڑ جاتی چونکہ دروازے پر بکری کا قبضہ رہتا تھا اس لیے ان سے ملنے والوں کو خاصی دقت ہوتی تھی کیونکہ سلیم اختر کا ڈرائنگ روم گھر کے اندر تھا اور صحن عبور کر کے جانا پڑتا تھا میں کبھی کبھی اپنے استاد کے گھر حاضری لگوانے جایا کرتا تھا تو اس بکری سے سامنا ہوتا کئی بار ایسا پروگرام بنا کہ اس بکری کو بکر منڈی چھوڑ آیا جائے مگر دن دہاڑے پر رونق علاقے میں ایسی دلیرانہ واردات کرنا کم از کم میرے بس میں نہ تھا سلیم اختر خود بھی اس بکری سے تنگ تھے اور انہوں نے اس ذاتِ شریف سے یوں بدلہ لیا کہ "بکری" کے عنوان سے ایک زبردست افسانہ لکھ مارا اور یوں بھی اس زمانے میں بطور افسانہ نگار ان کی خاصی شہرت تھی اور انہوں نے ابھی اردو تنقید میں نہ تو "چھکے" لگائے تھے اور نہ ہی چھکے چھڑائے تھے لاہور شفٹ ہونے کے بعد بطور نقاد ان کا ٹہکا ہوا اور وہ بھی اس طرح کہ سرگودھا کے ایوان و دبستان ان سے لرزاں ہیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر اردو دنیا کے انوکھے ہیں۔ وہ نہ صرف خود اکھاڑے میں اترتے ہیں بلکہ اپنے پٹھوں کو بھی تھپکیاں دے کر میدان میں اتارتے ہیں اور یوں وہ ادبی خلیفے کے ساتھ ساتھ لاہوری بادشاہ بھی ہیں ڈاکٹر سلیم اختر کی حیثیت استاد الاساتذہ کی ہے جن میں صنفِ نازک بھی شامل ہے۔ شاگردوں کے حوالے سے ان کی شہرت جنوب مغربی ایشیا تک پھیلی ہوئی ہے۔

ان کا ناک نقشہ گوارا ہے نہ خوبصورت ہیں اور نہ ہی بدصورت البتہ ان کی ٹانگیں بہت پتلی ہیں جو غالباً مسلسل اور بے تحاشا سائیکل چلانے کی وجہ سے ہوئی ہیں اس لئے کہ اکثر اوقات بغیر سائیکل کے بھی ان کی ٹانگیں پہیے کی طرح چلتی رہتی ہیں خواہ وہ کلاس روم کی طرف جا رہے ہوں انارکلی میں ہوں یا دفتر فنون کی طرف رواں دواں ان کی رفتار کا گراف ایک سا رہتا ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر نفسیات سے گہرا شغف رکھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ نفسیاتی مطالعہ کرتے ہیں خاص طور پہ عورت کا۔ اس سلسلے میں وہ عورت کے باطن میں صرف جھانک لیتے ہیں غوطہ خوری نہیں کرتے اسکی وجہ بیگم کا خوف بھی ہو سکتا ہے اور طبعی،

شرافت بھی !

ڈاکٹر سلیم اختر کی کئی کمزوریاں ہیں مگر دو ناگزیر ہیں۔ ایک سائیکل اور دوسرا پٹے دار پاجامہ ۔۔۔۔ میرزا ریاض کا یہ جملہ تو اب خاصی پرانی بات ہو چکی ہے کہ سلیم اختر کا خلوص وہاں تک جاتا ہے جہاں تک ان کی سائیکل جاتی ہے مگر اب ان کا خلوص خاصا پھیل چکا ہے اور ایک محتاط اندازے کے مطابق ۳۶۶۳۶ منٹ روزانہ سائیکل چلاتے ہیں سنا ہے کہ ایک دفعہ انہوں نے ایک اسکوٹر خریدا مگر بعد میں بیچ کر اس سواری سے توبہ کر لی اس اسکوٹر سے کئی لطیفے منسوب ہیں ایک دفعہ وہ اپنی بیگم کے ساتھ بازار گئے مال روڈ پر واپس آتے ہوئے ایک جگہ سگنل پر سرخ بتی کی وجہ سے انہیں رکنا پڑا جونہی سبز بتی آئی وہ یہ جا وہ جا ۔۔۔۔۔۔ ٹمپل روڈ پر اپنے گھر پہنچ گئے راستے میں بیگم سے باتیں بھی کرتے آئے اسکوٹر سے اترے اور بیگم سے کہا لائیے سامان مجھے دیدیں مگر پیچھے مڑکر دیکھا تو بیگم موجود نہ تھیں اتنے میں ان کی بیگم رکشے سے تریں اور غصے سے سلیم اختر کو اندر آنے کو کہا اور پھر جو کچھ ان کے ساتھ ہوا اسے رہنے دیجئے اس لئے کہ ہر شادی شدہ شریف آدمی کے ساتھ یہی ہوتا ہے دراصل سگنل پر ان کی بیگم اتر کر کھڑی ہو گئی تھیں اور وہ سبز بتی آتے ہی روانہ ہو پڑے تھے ۔ بہر حال وہ دن اور آج کا دن سلیم اختر اسکوٹر کا نام بھی لیتے نہیں اور سائیکل سے وفاداری قائم و دائم ہے وفاداری تو وہ پٹے دار پاجامے سے بھی نبھاتے ہیں کہ اب ان کا " نشانِ امتیاز " بن چکا ہے ۔ بازار میں کہیں بھی کسی مارکیٹ میں سودا سلف خریدنے یا آتے جاتے ہوئے بوشرٹ اور پٹے دار پاجامہ پہنے کوئی شخص نظر آجائے تو سمجھ لیجئے کہ ڈاکٹر سلیم اختر کے سوا کوئی اور نہیں عطاء الحق قاسمی راوی ہیں کہ ایک دفعہ وہ اپنی بیگم کے ساتھ خریداری کر رہے تھے کہ ان کی بیگم کی نظر ایک ایسے شخص پر پڑی جس نے پٹے دار پاجامہ پہن رکھا تھا۔ بیگم نے کہا کہ دیکھیں لوگ خواہ مخواہ سلیم اختر پر اعتراض کرتے ہیں اب تو اس شخص نے بھی پٹے دار پاجامہ پہن رکھا ہے عطاء الحق قاسمی بتاتے ہیں کہ جب ہم اسے دیکھنے اس کے قریب گئے تو وہ شخص ڈاکٹر سلیم اختر ہی نکلے

ڈاکٹر سلیم اختر خاصے مردم بیزار ہیں ۔ وہ نہ تو خود کسی جگہ گھنٹوں ٹک کر بیٹھ سکتے ہیں اور نہ ہی کسی اور کو کافی دیر اپنے پاس بٹھانا برداشت کر سکتے ہیں وہ اکیلے فلم دیکھتے ہیں تاکہ فلم کے دوران ان سے بات کرنے والا کوئی بھی نہ ہو وہ تنہائی پسند ہیں۔ اس لئے تقاریب میں کم جاتے ہیں اس لئے بھی کہ انہوں نے اپنے آپ کو ہر وقت لکھنے پڑھنے کے لئے وقف کر رکھا ہے اور گھر کی سب ذمہ داریاں ان کی بیگم نے سنبھال رکھی ہیں ۔ البتہ ان کے دروازے پر ڈاکٹر کا بورڈ دیکھ کر بعض مریض وقت بے وقت تنگ کرتے رہتے ہیں۔

ڈاکٹر سلیم اختر کے مزاج کی یوں تو کئی پرتیں ہیں مگر خاص بات یہ ہے کہ وہ یک طرفہ آدمی ہیں دوستی ہے تو دوستی اور دشمنی ہے تو دشمنی ہے منافقت نہ انہیں آتی ہے اور نہ انہوں نے کبھی کی ہے ۔ وہ جب کسی کے پیچھے پڑتے ہیں تو ہاتھ دھو کر پڑ جاتے ہیں جس طرح آجکل ڈاکٹر وزیر آغا کے پیچھے پڑے ہیں اور پورا دبستان سرگودھا ان کے شکنجے میں بری طرح جکڑا ہوا ہے کہ نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن ۔ آج پوری ادبی دنیا میں ڈاکٹر سلیم اختر کا طوطی بول رہا ہے ۔ ڈاکٹر انور سدید نے مجھے ان کا جانشین اول لکھا ہے مجھے یہ بھی قبول ہے اور ان کی شاگردی پر مجھے فخر بھی ہے ویسے بھی وہ بہت بڑے نقاد، منفرد افسانہ نگار، ماہرِ اقبالیات اور استادوں کے استاد ہیں ۔

●

آنکھ کھلنے پر کچھ دیر تک یہ احساس ہی نہ ہو سکا کہ میں کہاں ہوں، نہ میں اپنے کمرہ میں تھا اور نہ ہی اپنے بستر پر ـ تو پھر کہاں ؟ اعصاب میں عجب سرشاری تھی کہ کھلی آنکھیں ابھی تک بند آنکھوں کے سپنے میں تھیں ـ وہ عجب حسن تھا، شعلہ ؟ شبنم ؟ مہک ؟ تو پھر کیا — ؟ سراپا ایسا کہ عورت ہونے کے باوجود عورت نہ لگتی، تو پھر وہ کون تھی ؟ پری ؟ حور ؟ کہ ازلی عورت کا اکمل ترین پیکر ؟ شاید اسی لئے وہ بے لباس تھی، لیکن ایسی عریانی کہ نظارہ حجاب میں تبدیل ہو جائے اور نگاہ تارِ نقاب کا کام کرے — یہ وہ حسن تھا جس کا صرف تصوّر کیا جا سکتا ہے۔ یہ وہ سراپا تھا جو صرف خوابوں میں دیکھا جا سکتا ہے اور یہ وہ عورت تھی جو خوابوں میں بھی حاصل نہیں کی جا سکتی — میں اندھیرے کمرے میں جیسے دیر تک اسی کو جگمگاتے دیکھا کیا۔ تب میں نے زندگی کی پہلی (اور غالباً آخری دعا مانگی)

"اے خدا ! یہ عورت مجھے بخش دے اور اس کے عوض میری نصف زندگی لے لے۔"

میں اس وقت سالِ اوّل کا طالب علم تھا، اور یہ بات ہے ۱۹۵۱ء کی، اگرچہ یہ خواب عنفوانِ شباب میں دیکھے جانے والے بھیگے خوابوں کے برعکس تھا، مگر اعصاب پر اثرات ویسے ہی تھے۔ یہی نہیں بلکہ طویل مدت تک میں اس خواب کو جنسی معنی دیتا رہا لیکن کافی عرصہ بعد جب میں نے یونگ کی نفسیات کا مطالعہ کیا تو اس خواب سے وابستہ گہری معنویت کا انکشاف ہوا، خواب کا نسوانی پیکر عام مفہوم میں عورت نہ تھی بلکہ اپنے مکمل ترین حسن میں یہ تکمیلِ وجود کی علامت تھی ـ اس لئے صداقت کی مانند وہ لباس کی محتاج نہ تھی اور اس عالم میں تھی کہ اس کے اکمل ترین حسن کی چاندنی لبادوں میں مقیّد نہ کی جا سکتی تھی، ویسے بھی تکمیل کو خوش رنگی کے مصنوعی سہاروں کی ضرورت نہیں ہوتی ـ اسے حاصل کرنے کی دعا مانگنا بھی لاشعوری طور پر تکمیلِ وجود کی خواہش کا اظہار تھا ـ میں نہیں جانتا وہ دعا قبول ہوئی یا نہیں لیکن اگر میں کسی بھی امر میں تکمیل کے قریب قریب ہی پہنچ پایا تو جانوں گا کہ دعا قبول ہو گئی اور نصف زندگی کی قیمت پر یہ سودا مہنگا بھی نہیں ـ یہ میرا ایمان ہے ـ

وہ پیکرِ خواب زندگی بھر ذہن پر حاوی رہا اور میرے اعصاب اُسے فراموش نہ کر پائے ـ چنانچہ زندگی میں ملنے والی عورتوں کا اسی سے موازنہ کرتا رہا اور اسی لئے عام زندگی کی عورتیں اس کے مقابلے میں بہت ہیچ اور دلگیر اور بھیانک نظر آتیں، میں مارے کراہت کے پیچھے ہٹ جاتا ـ ان کی آوازوں کی کرختگی، جسم کی بدبو، نگاہوں کی مکاری اور مصنوعی پن، اور سب سے بڑھ کر

اُن کی نیتوں کا نیک نہ ہونا۔ یہ سب مجھے اُن سے بیزار کر دیتا۔ یہ رویّہ اِس حد تک پختہ ہو گیا کہ میں اچھا خاصا زن بیزار بن کر رہ گیا (جس کی باقیات مجھ میں ابھی تک موجود ہیں) لیکن جب خواب کے درست معنی سمجھ میں آ گئے اور علامت کی تہہ کو پا لیا تو مجھا کہ لاشعوری طور پر میں اُن مونثوں کو بھی اپنے وجود کی تکمیل کے ذرائع تصوّر کرتا تھا۔ جب کہ اُن کا مقصد کم سے کم کچھ اور ــــ اور زیادہ سے زیادہ گھر بسانا ہوتا تھا۔ جبکہ میں لفظ شادی سے ہی الرجک تھا کہ میں عمر بھر کو ایک عورت کے سنگ کے ساتھ بسر کرنے کا تصوّر بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اب اگرچہ وہ بات تو نہیں رہی مگر اب بھی عورت سے اُس کے مونث پن کے علاوہ کچھ اور بھی چاہتا ہوں، وہ حُسن جو محض دائروں اور قوسوں کا مرہونِ منّت نہ ہو، ایسی دلبری جو دل لینے دینے کی سوداگری سے مشروط نہ ہو اور قُرب کی وہ سرشاری جو اعصاب اور غدود کی محتاج نہ ہو۔ اس لئے مجھے اپنے بعض ادیب دوستوں کے برعکس مونثوں کے پیچھے پیچھے پھرنے کی کبھی بھی ضرورت محسوس نہ ہوئی، نہ ہی میں نے کبھی حقیقی یا مفروضہ یا مبیّنہ تعلقات کو بارہ مصالحے کی چاٹ بنا کر حلقۂ احباب کی رال ٹپکانے کی کوشش کی ہے۔ جہاں تک عورت کے چکّروں کا تعلّق ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ میں نے نِروان حاصل کر لیا ہے۔ اِس لاتعلّقی پر مبنی جس رویّہ نے جنم لیا اُس نے مجھے نفسیاتی مضامین اور جنسی افسانے لکھنے میں بہت مدد دی۔ جسم پر لکھنے میں دو بڑے خطرات مضمر ہیں۔ ایک مصلحِ اخلاق نہ بنا جائے، دوسرے سنسنی خیز نہ بنا جائے، جہاں یہ دونوں یا ان میں سے ایک نے بھی غلبہ پا لیا تو جان لو کہ انسان کا بیڑا غرق ہو گیا۔ اِسی لئے منٹو بہتر افسانہ نگار ثابت ہوا۔ جب کہ تمام تر بے باکی کے باوجود لارنس جسم کی اخلاقیات کا داعی بن کر رہ گیا۔

میرے لئے بر تر وجود تحریر سے عبارت ہے۔ اِس لئے ڈھائی سطر اس کے بارے میں بھی:

میں نے کم عمری سے لکھنا شروع کر دیا تھا اور پانچویں جماعت میں اپنا نام شائع کرا چکا تھا (اس زمانے میں میں انبالہ میں تھا) دسویں جماعت (۱۹۵۱ء) تک بچّوں کے تمام اچھے اور اہم پرچوں میں میری کہانیاں، خط، مضامین اور نظمیں شائع ہوتی رہیں۔ جب کہ اس وقت تک کہانیوں کی چار یا پانچ کتابیں بھی طبع ہو چکی تھیں۔ آٹھویں جماعت میں تھا کہ لاہور کے ایک فلمی پرچہ میں میرے پہلے دو افسانے "قربانی" اور "ساحرہ" شائع ہوئے۔ اب تو اس پرچہ کا نام بھی یاد نہیں، البتّہ اتنا دھیان پڑتا ہے کہ اس کی پیشانی پر "پاکستان میں سب سے زیادہ چھپنے والا" رقم ہوتا تھا لیکن میرے دو افسانے ہی شائع کر کے اُس کی روح قفسِ صحافت سے پرواز کر گئی ــــ ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسیٰ نہ ہوا!

۱۹۵۱ء میں (جب کہ میں میٹرک کا طالب علم تھا) "شمع" دہلی میں "ایک مجبور ایک طوائف" اور "کٹھ پتلی" شائع ہوئے۔ یہ دونوں افسانے کرسچین کال گرلز کے بارے میں تھے۔ کلبوں کا ماحول تھا، روشنیاں تھیں اور شراب و شباب تھا۔

ابّا جی کی عبدالحمید عدمؔ سے بہت دوستی تھی۔ اسی ناطے میرا اُن کے گھر آنا جانا بھی تھا۔ ابّا جی نے عدمؔ صاحب سے میرے لکھنے کے شوق کا ذکر کیا تو انھوں نے میری حوصلہ افزائی کرتے ہوئے میری شاعری کی اصلاح شروع کر دی شاعری کیا تھی بس نثری غزلیں تھیں، جنھیں عدمؔ صاحب کمالِ محنت سے پابند غزلوں میں تبدیل کر دیتے، لیکن جلد ہی مجھے یہ احساس ہو گیا کہ "میوز" مجھ پہ مہربان نہیں۔ چنانچہ اُسے خود سے بہتر لوگوں کے لئے چھوڑ دیا۔ اب اس "شاعری" میں سے مجھے صرف اپنا تخلّص یاد رہ گیا ہے ــــ انجانؔ!

ذرا ڈاکٹر سلیم اختر انجانؔ لکھیے تو کیا مضحکہ خیز لگتا ہے۔

کالج میں ـــ میں فلسفہ کا طالب علم تھا اور تصوّف پر کتابیں پڑھتا تھا۔ تصوّف کا توڑ فرائڈ نے کیا جب کہ فلسفہ پڑھنے کی خواہش بھی بعد کے نفسیاتی مطالعے میں دب کر رہ گئی۔ ۱۹۵۵ء میں بی اے کے بعد میرے پاس ڈگری کے علاوہ اپنی اعصابیت بھی تھی جس میں وقت کے ساتھ ساتھ اضافہ ہوتا جا رہا تھا، تب میں نے خود شناسی (یا پھر خود تشخیصی ؟) کے لئے تحلیلِ نفسی کا مطالعہ شروع کیا اور اپنی ذات کے لئے اسے بے حد سود مند پایا کہ خود میں نیوراتی ہونے سے بھی بچا اور دوسروں کے نفسیاتی مسائل اور ذہنی اُلجھنوں کی تفہیم کے لئے بھی نگاہ پیدا ہو گئی۔ نفسیات اور جنس پر میری متعدد کتابیں ہیں۔ جن کے مطالعے کے بعد مجھے اکثر قارئین اپنی جنسی اور نفسیاتی اُلجھنوں کے بارے میں خطوط لکھتے رہتے ہیں۔ میں نے انھیں اپنی بساط بھر مشورے دیئے ہیں اور خوشی کی بات ہے کہ اکثر نے اُن کی افادیت کا اعتراف بھی کیا ہے۔

جو شخص نفسیات میں یوں ڈوبا ہو کہ اپنی ایک بیٹی کا نام سائیکی رکھے اُس کے لئے اپنی تحریروں میں نفسیات سے صرفِ نظر ممکن نہ تھا۔ اسی لئے میری تحریروں میں نفسیات نے معانی بھرے ہیں۔ وہ جو دل کا پردہ تھا آخر کو اپنا فن ٹھہرا۔

آج سفید سر، دو درجن کتابوں، ایک بیوی اور تین بچوں کے ساتھ مُڑ کر پیچھے دیکھتا ہوں تو وہی خواب والی عورت مکمل ترین بے حجاب حسن کے ساتھ نظر آتی ہے۔ وہ کچھ اشارہ کر رہی ہے، غالباً پیچھے مُڑ کر دیکھنے سے منع کر رہی ہے کہ پتھر بن جانے کا خدشہ ہے۔ شاید وہ یہ سمجھا رہی ہو کہ میں تو قدم قدم تمھارے ساتھ چل رہی ہوں یا پھر مستقبل میں ملنے کی نوید سُنا رہی ہو۔ مدتوں میری یہ آرزو رہی تھی کہ اسے ایک مرتبہ پھر خواب میں دیکھوں، لیکن اب میں سمجھتا ہوں کہ ایسی آرزو بے کار ہے کہ وہ میری ذات ہی کا حصہ ہے، یہ تو میری ANIMA ہے۔

●

جگن ناتھ آزاد

اقبال اور ہمارے فکری رویّے

اقبال نے ۱۹۱۴ء میں جب کہا تھا "من ندائے شاعرِ فردا ستم" تو غالباً وہ کوئی قبولیتِ دعا کا لمحہ تھا۔ ۱۹۱۴ء کے بعد ہندوستان اور ۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستان اور پاکستان کی شاعری میں طرح طرح کے رجحانات نمودار ہوئے لیکن اقبال کے شاعرِ فردا ہونے کا تصوّر ایک اٹل نظریے کی طرح رہا۔ اقبال کے متعلق سید عبداللطیف، ڈاکٹر صادق، ڈاکٹر سچدانند سنہا، کلیم الدین احمد، فراق گورکھپوری اور باقر مہدی کے منفی انداز کی تحریروں کے باوجود اقبال کی از سرِ نو دریافت کا کام مسلسل جاری رہا اور اقبال صدی تقاریب کے سال میں جو ۱۹۷۷ء سے شروع ہو کے آج تک چل رہا ہے، یہ حقیقت کھل کے سامنے آئی ہے کہ ایک تو اقبال پر بحیثیت شاعر کے بہت کام ہونا باقی ہے اور دوسرا اقبال کے فکر کی تہ در تہ معنویت کی تلاش میں اقبال پرستی کے چوکھٹے کے اندر نہیں بلکہ اس سے آزاد ہو کے ہمیں بہت کام کرنا ہے۔

دراصل اس ضمن میں صرف ہندوستان اور پاکستان ہی میں نہیں بلکہ دنیا بھر میں کام شروع ہو چکا ہے لیکن یہ ابھی ابتدائی منزلوں میں ہے۔ یہ کام اس کام کا ایک ارتقائی تسلسل ہے جو اقبال کی زندگی میں ہی شروع ہو گیا تھا لیکن یہ تسلسل ہو کر بھی پرانے کام سے بہت مختلف ہے اور اس کے سامنے جس طرح سے نئے طور ابھر رہے ہیں اور نئی برقِ تجلی چمک رہی ہے۔ اس کی موجودگی میں یہ مرحلۂ شوق آسانی سے طے ہوتا نظر نہیں آتا۔

اقبال پر اس نئے زاویے اور نئے اپروچ کے ساتھ کام کرنے والوں میں ڈاکٹر سلیم اختر کو ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔ ہندوستان اور پاکستان میں اس وقت بعض ادیب اور نقاد ایسے ہیں جو اگرچہ متنوع موضوعات پر کام کر رہے ہیں لیکن ان کے بارے میں یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ انھوں نے اقبالیات ہی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا ہے۔ سلیم اختر کا شمار انہی ادیبوں میں ہے۔

اقبال پر سلیم اختر کا کام ہر اعتبار سے ایک نئے اندازِ فکر کا حامل ہے۔ یہ کام سلیم اختر کے اپنے شعوری تجربے کا نتیجہ ہے دوسروں کی صدائے بازگشت نہیں۔ یہ کہنے کی ضرورت مجھے اس لئے محسوس ہوئی ہے کہ ہندوستان اور پاکستان میں اقبال پر زیادہ تر کام "بازگوئی" کی ذیل میں آتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اقبال پر اس وقت تک کوئی پندرہ سو سے زیادہ کتابیں چھپ چکی ہیں۔ لیکن ان کتابوں میں نئی باتیں پندرہ سو تو کیا پانچ سو بھی نہیں ہوں گی۔ حالانکہ کلامِ اقبال ایک ایسا سمندر ہے کہ اس میں سے گوہر شناس غواص کے لئے ہر بار ایک نیا موتی نکال لانا دشوار کام نہیں۔ ہاں دشواری یہ ہے کہ اس سمندر کی گہرائی بہت

زیادہ ہے۔

سلیم اختر کو اس بات کا احساس ہے کہ آج اقبال کے نقادوں کے سامنے سب سے بڑا کام اقبال کی از سرنو دریافت ہے اور اس کے لئے ضروری ہے کہ اقبال کی زندگی شخصیت اور شاعری کے ہر گوشے پر کھل کے بحث کی جائے۔ اقبال کو پہلے سے پیر پیغمبر مان کے ان پر قلم اٹھانے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ نقادوں کی تحریریں مدلل مداحی سے آگے نہ جا سکیں گی اپنے مقالے "اقبال کا نفسیاتی مطالعہ" میں سلیم اختر اس تنقیح طلب امر پر بحث کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

"اقبال کو ایک مفکر مصلح اور فلسفی کے روپ میں پیش کرنے والے یہ فراموش کر دیتے ہیں کہ کبھی وہ جوان بھی ہوگا اور قلب ونظر اور ذہن متنوع اثرات کی آماجگاہ بھی بنے ہوں گے چنانچہ اگر غلطی سے کوئی چونکا دینے والی بات سامنے آجائے تو ذہن کو گویا ۴۴۰ والٹ کا جھٹکا سا لگتا ہے"

اس ضمن میں شبلی کا ذکر کرتے ہوئے حالی کی یہ تحریر دھراتے ہیں۔

"........ کوئی کیونکر مان سکتا ہے کہ یہ اس شخص کا کلام ہے جس نے "سیرۃ النبی"، "الفاروق" اور "سوانح مولانا روم" جیسی مقدس کتابیں لکھی ہیں۔ غزلیں کاہے کو ہیں شراب دو آتشہ ہیں۔ جس کے نشے میں خمارِ چشمِ ساقی ملا ہوا ہے"۔ (حالی بنام شبلی)

مشہور انگریزی مصنف نراد چوہدری ٹیگور پر اپنے مقالے میں لکھتے ہیں۔

"بنگالی ٹیگور کو بت بنا کر جتنا زیادہ اس کی پرستش میں مصروف ہیں اتنا ہی وہ صداقت سے دور ہوتے چلے جا رہے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ ٹیگور کی حقیقی عظمت کو دیکھنے کے بھی ناقابل بنتے جا رہے ہیں اس سے معبود اور عبد دونوں کو نقصان پہنچ رہا ہے"۔ (۱)

گذشتہ کئی برسوں سے ہندوستان اور ہندوستان سے باہر اقبال سیمیناروں میں شرکت سے اور اقبال کے متعلق اکثر مقالات در کتابوں پر نظر ڈالنے سے میرے دل میں کئی بار یہ سوال پیدا ہوا ہے کہ کیا نراد چودھری نے جو بات ٹیگور کے متعلق لکھی ہے اس کا اطلاق کہیں اقبال کے تعلق سے ہم لوگوں پر بھی تو نہیں ہو رہا ہے۔

اقبال کو خود اس بات کا شدید احساس تھا کہ ایک ایسا وقت آ سکتا ہے کہ جب میری شخصیت اور شاعری دونوں ایک معبود کی صورت اختیار کر لیں۔ چنانچہ اپنی شاعری کے متعلق انہوں نے کئی موقعوں پر قاری کو یہ کہہ کر اس خطرے سے آگاہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

کرمِ شب تابِ است شاعر در شبستانِ وجود | در پر و بالش فروغے گاہ ہست و گاہ نیست

گاہ مری نگاہِ تیز چیر گئی دلِ وجود | گاہ الجھ کے رہ گئی میرے توہمات میں

نہ بینی خیر ازاں مردِ فرودست | کہ بر من تہمت شعر و سخن بست

اقبال کے متعدد شاعرانہ اسالیب کے یہ دو ایک پرتو ہیں جو ہمیں ان اشعار میں نظر آرہے ہیں۔

فراق گورکھپوری کی طرح کے نقاد ان اشعار سے جو مفہوم پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ ادبی دیانت پر مبنی نہیں انہیں مندرجہ ذیل اشعار کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے جو اقبال نے اپنے متعلق غنی کاشمیری کی زبان سے کہلوائے ہیں

(۱) "السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا" بمبئی ۱۱ مارچ ۱۹۷۳ء

خلک ما را بے شررد انی اگر　　بر درونِ خود یکے بکشا نظر
ایں ہمہ سوزے کہ داری از کجاست　　ایں دمِ بادِ بہاری از کجاست
ایں ہمہ باد است کز تاثیر او
کوہسارِ ما بگیرد رنگ و بو

اے کہ خواندی خطِ سیمائے حیات　　اے بہ خاور دادہ غوغائے حیات
اے ترا آہے کہ می سوزد جگر　　تو از و بے تاب و ما بے تاب تر
اے ز تو مرغِ چمن را ہائے و ہو　　سبزہ از رشکِ تو می گیرد وضو
اے کہ از طبعِ تو کشتِ گل رسید
اے ز امید تو جانہا پر امید

از نوا تشکیلِ تقدیرِ امم　　از نوا تخریب و تعمیرِ امم
نشترِ تو گرچہ در دلہا خلید　　مر ترا چونانکہ ہستی کس ندید
پردۂ تو از نوائے شاعری است　　آنچہ گوئی ماورائے شاعری است
تازہ آشوبے فگن اندر بہشت
یک نوا مستانہ زن اندر بہشت

دیسے اقبال نے یہ بات کئی اسالیب کے ذریعے سے اپنے قاری تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔

کس ندانست کہ من نیز بہائے دارم　　آں متاعم کہ شد دوست زبے بصراں
چو رخت خویش بربستم ازیں خاک　　ہمہ گفتند با ما آشنا بود
ولیکن کس ندانست ایں مسافر　　چہ گفت و با کہ گفت و از کجا بود
از نوائے من قیامت رفت و کس آگاہ نیست

دریں گلشن پریشاں مثلِ بویم　　نمی دانم چہ می خواہم چہ جویم
بادہ رازم و پیمانہ گسارے جویم　　در خرابات مغاں گردشِ جامے جویم
نہ من آغاز و نے انجام جویم　　ہمہ رازم جہاں را نہ جویم
نوجوان خام سوزے سخنم تمام سوزے　　غزلے کہ سرایم بہ تو ساز گار جویم
دیاں بینی ز سیر بوستانم　　اگر جانت شہید جستجو نیست
نمائم آں چہ ہست اندر رگِ گل　　بہار من طلسم رنگ و بو نیست

اقبال کے فلسفہ و شعر کی ساری داستان ایک داستان تلاشِ حق ہے فلسفہ اقبال کے لئے زندگی کا ایک نظریہ نہیں بلکہ زندگی بسر کرنے کا ایک سلیقہ ہے۔ فلسفہ اقبال کے لئے کوئی الگ تھلگ موضوع نہیں ہے بلکہ ہر موضوع کے مطالعے کا ایک انداز ہے

فلسفے کو ایک الگ موضوع تصور کیا جائے تو اقبال اس کے شدید ترین مخالف نظر آتے ہیں انھوں نے ایک موقع پر یہ کہا تھا۔

"میں سمجھتا ہوں کہ دنیا کے سامنے پیش کرنے کے لئے میرے پاس کوئی فلسفہ نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں مختلف نظام ہائے فلسفہ سے نفرت کرتا ہوں۔ مجھے نہ فلسفے کے اصولوں پر بھروسہ ہے نہ اس کے نتائج پر۔ شاید ہی کسی شخص نے فلسفے کی اس شدت سے تردید کی ہو جیسے میں نے کی ہے اس فلسفے کی جس سے مذہب کے اساسی اور قطعی حقائق تک پہنچنے کی کوشش کی جاتی ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ میں نے ایسے موضوعات پر لکھا ہے جس سے فلسفیوں کو بھی دلچسپی ہے لیکن میرے لئے یہ موضوعات محض فلسفیانہ استدلال و براہین نہیں ہیں بلکہ جیتے جاگتے تجربات کی حیثیت رکھتے ہیں" [1]

فلسفے کی جانب اقبال کا یہ رویہ اس اعتبار سے بڑا معنی خیز ہے کہ ان کے دل ناصبور کی ساری تڑپ ان کے سوالات میں سمٹ کر آگئی ہے۔ اقبال کا دل سراپا استفسار، سراپا سوال اور سراپا جستجو ہے اور ہر وقت "کیونکر" اور "کیسے" کی عقدہ کشائی میں مصروف رہتا ہے۔ یہاں اقبال براؤننگ کے ہمنوا ہیں جو یہ کہتا ہے کہ "زندگی مفہوم سے لبریز ہے۔ میرا مقصد اس مفہوم تک پہنچنا ہے۔" اور استفسار کی کیفیت اقبال کے یہاں اوّل سے آخر تک نظر آتی ہے۔

مطمئن ہے تو پریشاں مثل بو رہتا ہوں میں — زخمی شمشیر تیغ جستجو رہتا ہوں میں
یہ تلاش متصل شمع جہاں افروز ہے — توسن ادراک انساں کو خرام آموز ہے
آنکھ وقف دید تھی لب مائل گفتار تھا — دل نہ تھا میرا سراپا ذوق استفسار تھا
اے مئے غفلت کے سرشار و کہاں رہتے ہو تم — کچھ کہو اس دیس کی آخر جہاں رہتے ہو تم
وہ بھی حیرت خانۂ امروز و فردا ہے کوئی — اور پیکار عناصر کا تماشا ہے کوئی
آدمی واں بھی حصار غم میں ہے محصور کیا — اس ولایت میں بھی ہے انساں کا دل مجبور کیا
یاں تو اک مصرع میں پہلو سے نکل جاتا ہے دل — شعر کی گرمی سے کیا واں بھی پگھل جاتا ہے دل
کیا وہاں بجلی بھی ہے دہقاں بھی ہے خرمن بھی ہے — قافلے والے بھی ہیں؟ اندیشۂ رہزن بھی ہے
واں بھی کیا فریاد بلبل پر چمن روتا نہیں — اس جہاں کی طرح واں بھی درد دل ہوتا نہیں
آہ وہ کشور بھی تاریکی سے کیا معمور ہے — یا محبت کی تجلی سے سراپا نور ہے
جستجو میں ہے وہاں بھی روح کو آرام کیا — واں بھی انساں ہے قتیل ذوق استفہام کیا
تم بتا دو راز جو اس گنبد گرداں میں ہے — موت اک چبھتا ہوا کانٹا دل انساں میں ہے
صبح ازل جو حسن ہوا دلستان عشق — آواز کن ہوئی تپش آموز جان عشق
یہ حکم تھا کہ گلشن کن کی بہار دیکھ — اک آنکھ لے کے خواب پریشاں ہزار دیکھ
منزل کا اشتیاق ہے گم کردہ راہ ہوں — اے شمع! میں اسیر فریب نگاہ ہوں
میں حسن ہوں کہ عشق سراپا گداز ہوں — کھلتا نہیں کہ ناز ہوں میں یا نیاز ہوں
آرزو نور حقیقت کی ہمارے دل میں ہے — لیلیٰ ذوق طلب کا گھر اس محمل میں ہے
کس قدر لذت کشود عقدۂ مشکل میں ہے — لطف صد حاصل ہماری سعی بے حاصل میں ہے

[1] "EMINENT MUSALMANS" — MADRAS 1926

دردِ استفہام سے واقف ترا پہلو نہیں
جستجوئے رازِ قدرت کا شناسا تو نہیں

میں کہاں ہوں تو کہاں ہے یہ مکاں کہ لامکاں ہے
یہ جہاں مرا جہاں ہے کہ تری کرشمہ سازی

خرد مندوں سے کیا پوچھوں کہ میری ابتدا کیا ہے
کہ میں اس فکر میں رہتا ہوں میری انتہا کیا ہے

کس کی نمود کے لئے شام و سحر ہیں گرمِ سیر
شانۂ روزگار پر بارِ گراں ہے تو کہ میں

اور یہ کوئی محض اتفاق کی بات نہیں کہ اقبال کے آخری مجموعۂ کلام کی آخری نظم کا آخری شعر ایک سوال کی صورت میں ہمارے سامنے آتا ہے۔

اگر مقصودِ کل میں ہوں تو مجھ سے ماورا کیا ہے
مرے ہنگامہ ہائے نو بہ نو کی انتہا کیا ہے

اقبال نے جن فلسفیانہ مسائل کے حل کو خالص شاعری کے انداز میں پیش کیا ہے ان کی فلسفیانہ اور شاعرانہ دونوں طرح کی اہمیت سے انکار نہیں کیا لیکن اقبال کے اکثر نقادوں نے اقبال کے دلِ ناصبور کی اس کیفیت کو جو اقبال کے یہاں استفہام کی صورت میں نمودار ہوئی ہے جس طرح سے نظر انداز کیا ہے۔ وہ بھی برصغیر کے اردو اور فارسی ادب کا ایک بہت بڑا المیہ نوعیت کا باب ہے۔

اقبال کی شاعری کا ان سوالات کے ساتھ دوسرا اہم پہلو اس کا ابہام ہے۔ جس کی طرف اقبال نے خود STRAY REFLECTION میں اشارہ کیا ہے۔

"میتھو آرنلڈ بہت صحت اور صراحت پسند شاعر ہے۔ میں شاعری میں ایک حد تک اخفا اور ابہام کا عنصر پسند کرتا ہوں۔ کیونکہ مبہم اور مخفی پیرایہ جذباتی اعتبار سے عمیق و غائر معلوم ہوتا ہے۔"[1]

یہ اخفا و ابہام کا عنصر اقبال کی شاعری کی جان ہے لیکن اخفا و ابہام کے اس عنصر کو اقبال نے ایک ایسا اسلوب عطا کیا ہے کہ بظاہر اقبال کا اندازِ بیان کئی موقعوں پر براہ راست اور دوٹوک معلوم ہوتا ہے۔ حالانکہ اگر ذرا غور کیا جائے تو وہی اندازِ بیان جو بادی النظر میں براہ راست نظر آتا ہے دراصل تہہ در تہہ معنویت کا حامل ہے چونکہ اقبال کے نقادوں نے اقبال کی شاعری پر نہیں لکھا۔ یا نکر اقبال کے مقابلے میں بہت ہی کم لکھا ہے۔ اس لئے نئی نسل کے بعض ان شاعروں اور ادیبوں کے دلوں میں جن کا ادبی روایت کے ساتھ رشتہ کمزور تھا یہ خیال پیدا ہو گیا کہ اقبال کی شاعری محض POETRY OF STATEMENT ہے ان شاعروں اور ادیبوں کو کچھ ایسے اشعار بھی محض ایک صحافتی قسم کا بیان نظر آنے لگے جن میں روحِ شعر پردہ بہ پردہ اور تہہ بہ تہہ تڑپتی نظر آ رہی تھی جیسے

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق
نے ابلہ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تری رضا کیا ہے

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ
دنیا ہے تری منتظرِ روزِ مکافات

اگر لہو ہے بدن میں تو خوف ہے نہ ہراس
اگر لہو ہے بدن میں تو دل ہے بے وسواس

۱۔ "شذراتِ فکرِ اقبال" لاہور ۱۹۷۳ء صفحہ ۱۴۰

دیا اقبال نے ہندی مسلمانوں کو سوز اپنا یہ اک مرد تن آساں تھا تن آسانوں کے کام آیا

حالانکہ یہ سامنے کی بات ہے کہ اقبال نے اردو شاعری کو جو آہنگ دیا اس سے پہلے ہم اردو والے اس آہنگ سے آشنا تھے۔ یہ آہنگ اقبال کے ساتھ ہی ختم ہو گیا۔ اس لئے نئی نسل کے لئے اس آہنگ کو پہچاننا آسان نہیں تھا۔ ان حالات میں اقبال کے کلام کی دبیز کیفیت پر اور زیادہ لکھنے کی ضرورت تھی لیکن اقبال کے نقادوں نے بڑی حد تک اسے بھی نظر انداز کیا سلیم اختر کی نگاہ ان تمام مسائل تک پہنچی ہے ان کی تالیف " اقبال کا ادبی نصب العین " اہل نظر کو دوبارہ اقبال کے حسن کلام کی طرف متوجہ کرنے کی ایک کامیاب کوشش ہے۔ " فکر اقبال کے منور گوشے " میں انہوں نے کمال محنت سے ان مضامین کو جمع کیا ہے۔ جن میں ایک طرف اقبال کی شاعری پر بھرپور روشنی پڑتی ہے۔ تو دوسری طرف اقبال کی شاعری کے وہ پہلو اجاگر ہوتے ہیں جنہیں آج ارادہ یا سہل انگاری کی بناء پر نظر انداز کیا جا رہا ہے اس کتاب کے قریباً تمام مقالات اقبال کے فکر و فن کے نئے پہلوؤں کو پیش کرتے ہیں۔

ان دو تالیفات کے بعد سلیم اختر " اقبال اور ہمارے فکری رویے " کے نام سے اقبال کے متعلق اپنے مقالات کا مجموعہ پیش کر رہے ہیں۔ یہ مجموعہ جو آٹھ مقالات پر مشتمل ہے اقبالیات میں ہر اعتبار سے ایک گراں قدر اضافہ ہے۔

" اقبال ممدوح عالم " میں سلیم اختر نے اقبال کے فکر و فن کی قدر و قیمت کا تعین کرتے ہوئے ایک بہت عمدہ بات کہی ہے۔ اقبال شناسی کی بین الاقوامی روایت کے پیش نظر کلام اقبال میں آفاقیت کا مسئلہ اپنے حل کے لئے کسی نظریاتی بحث سے ہٹ کر اب علمی صداقت کا روپ دھار چکا ہے۔ یہ تو آفتاب آمد دلیل آفتاب ایسی بات ہے اس ضمن میں اس امر کی طرف بھی اشارہ کر دینا چاہیے کہ مختلف ممالک میں اقبال شناسی کے آغاز اور پھر ایک باضابطہ فکری روایت بننے کا باعث ہماری یا دوسری حکومتوں کی سرپرستی نہ تھی۔ یہ درست ہے کہ کبھی کبھار غلطی سے ہمارے سفارت خانوں نے بھی یوم اقبال کا اہتمام کیا ہوگا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ نکلسن، آربری، ہربرٹ ریڈ، ای ایم فارسٹر، این میری شمل، بوزانی، لوسی کلاڈ، گورڈن پولونسکایا، پریگارینا، نتاشا اور ماریا سنے جیسی ایسی شخصیات محض ہمارے سفیروں کے اثر و رسوخ کی وجہ سے اقبال کو اپنا موضوع نہ بنا سکتی تھیں۔ سلیم اختر کی اس پر مغز تحریر میں میں یہ اضافہ کروں گا کہ اگر یوم اقبال کو سفیروں اور سفارت خانوں کے تعلق سے آزاد کر دیا جائے تو اقبال کا فکر و فن اور زیادہ ادب فلسفہ، تاریخ اور سیاست کے طالب علموں کا مرکز فکر و نظر بن جائے گا۔ کوئی ایک ڈیڑھ ماہ قبل روس میں اس کام کی ایک جھلک جو روس میں ہو رہا ہے میں دیکھ کے آیا ہوں، پریگارینا کی اقبال پر دو کتابوں کا ذکر ڈاکٹر سلیم اختر نے کیا ہے۔ کلام اقبال کے ساتھ پریگارینا کی دلچسپی کا جو عالم ہے۔ وہ میں شاید لفظوں میں بیان نہ کر سکوں ماسکو میں پروفیسر مادام بیوواکے گھر جب پریگارینا نتاشا راقم التحریر سے ملنے آئیں تو کلیات اقبال ان کے ہاتھ میں تھی۔ اور اس محفل میں کوئی آٹھ گھنٹے تک مسلسل اقبال اور فکر و فن اقبال کا ذکر جاری رہا۔ پریگارینا کے دو شاگرد ایک طالب علم اور ایک طالبہ علم۔ جن کے نام میں بھول رہا ہوں۔ اس وقت اقبال پر ریسرچ کر رہے ہیں۔ طالب علم " گلشن راز جدید " پر اور طالبہ علم " ضرب کلیم " پر۔ یہی کیفیت میں نے لینن گراڈ میں دیکھی اور تاجکستان میں تو بزم اقبال ایک بڑی فعال ادبی جماعت ہے جس کے اجلاس ہر ہفتہ روز منعقد ہوتے ہیں۔ ایران کے ڈاکٹر احمد علی رجائی کی یہ بات غلط نہیں ہے کہ " اقبال ایک نو دریافت براعظم کی مانند ہیں جس میں کتنی ہی دلآویز اور قابل غور چیزیں ہنوز بحث طلب ہیں " لیکن ان دلآویز اور قابل غور چیزوں کی طرف ہم اہل ہند اور اہل پاکستان نظر اٹھا کے دیکھیں بھی تو۔

"اقبال کے اساتذہ" ایک گہرے غور و فکر کا نتیجہ ہے اور اس میں سلیم اختر نے جو نکتہ پیدا کیا ہے وہ خاصا اہم ہے۔
ان کی اس بات کی تردید مشکل ہے کہ اقبال کے اساتذہ کا ذکر کرتے وقت ہمیں داغ اور آرنلڈ سے کم حیثیت حالی اکبر اور رومی کو
نہیں دینی چاہیئے بلکہ اس ضمن میں مرشد روم کا مرتبہ تو سب سے بلند ہے لیکن مولوی میر حسن کو داغ اور آرنلڈ کی صف میں رکھنا مناسب
معلوم نہیں ہوتا یہ بات ایک مفروضہ ہے کہ اگر اقبال مولوی میر حسن سے فارسی نہ پڑھتے تو کسی اور سے بھی پڑھ کر فارسی کے اتنے
بڑے شاعر ہو سکتے تھے اس طرح کے
HYPOTHESIS کو بنیاد بنا کر کسی نتیجے پر پہنچنا دشوار ہے کیونکہ اس طرح سے نکالا
ہوا نتیجہ دونوں طرح کی متضاد آراء پر مبنی ہو سکتا ہے۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ اگر اقبال اسپین جا کر مسجد قرطبہ نہ دیکھتے تو وقت اور عشق
کے متعلق وہ ایسے اشعار کہہ سکتے تھے جو اس نظم میں موجود ہیں اور میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتا۔ مولوی میر حسن کو داغ اور آرنلڈ کی
سطح پر رکھنا اس لئے بھی موزوں نہیں کہ اقبال مولوی میر حسن کے ہاتھ میں اس وقت آئے جب وہ بچے تھے اور بچے کی ذہنی تربیت
میں استاد کا جو حصہ ہے اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ کچی مٹی کس دست باہنر میں پہنچتی ہے اس کا مٹی کے مستقبل کے ساتھ گہرا
تعلق ہے۔ "علامہ اقبال اور نیرنگِ خیال" ایک بھرپور مقالہ ہے جو "نقوش" (لاہور) کے "نیرنگ خیال، اقبال نمبر" میں شائع
ہوا۔ یہ اس خاص نمبر کا آخری مقالہ ہے اور میرے نزدیک اس موضوع پر اس کی حیثیت یقیناً "حرف آخر" کی ہے۔

"اقبال اور ہمارے فکری رویے" زیر نظر مجموعہ مقالات کا اہم ترین مضمون ہے جس میں ڈاکٹر سلیم اختر نے فکر اقبال کے تناظر
میں اقبال کے متعلق موجودہ فکری رویوں کا تجزیہ کیا ہے۔ اس سلسلے میں برصغیر کے فکری رویوں میں سرسید کی تحریک کا ذکر کرتے ہوئے
ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں کہ اقبال نے "سرسید، حالی اور اکبر سے خصوصی طور پر متاثر ہونے کے باوجود انگریزوں اور انگریزیت
سے وابستہ اشیاء اور افکار و تصورات کو چنداں اہمیت نہ دی بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ انہوں نے ان سب کو ہدفِ تنقید بنایا"
میرے نزدیک یہ تصویر کا ایک پہلو ہے اقبال نے مغرب کی جانب دو رویے اختیار رکھے۔ جہاں تک مغرب کی مادیت پرستی اور ظاہری
چمک دمک کا تعلق ہے اسے اقبال نے ہدف تنقید بنایا "لیکن مغربی علوم و فنون کو اقبال نے ہمیشہ سراہا ہے۔ مثلاً "تشکیلِ جدید
الٰہیات اسلامیہ" میں آپ لکھتے ہیں "پچھلے پانچ سو برس سے الٰہیات اسلامیہ پر جمود کی ایک کیفیت طاری ہے۔ وہ دن گئے جب یورپ
کے افکار دنیائے اسلام سے متاثر ہوا کرتے تھے۔ تاریخ حاضرہ کا سب سے زیادہ توجہ طلب مظہر یہ ہے کہ ذہنی اعتبار سے عالم اسلام
نہایت تیزی کے ساتھ مغرب کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس تحریک میں بجائے خود کوئی خرابی نہیں کیونکہ جہاں تک علم و حکمت کا تعلق ہے
مغربی تہذیب دراصل اسلامی تہذیب ہی کے بعض پہلوؤں کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے لیکن اندیشہ یہ ہے کہ اس تہذیب کی
ظاہری آب و تاب کہیں اس تحریک میں حارج نہ ہو جائے اور ہم اس کے حقیقی جوہر ضمیر اور باطن تک پہنچنے میں قاصر رہیں" (۱) اس
موقع پر اس خط کا حوالہ دینا بھی نامناسب نہ ہوگا۔ جو علامہ اقبال نے صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کو اس وقت لکھا جب آپ
THE RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUGHT IN ISLAM کو مرتب کرنے کا ارادہ کر رہے تھے اس
خط میں اقبال لکھتے ہیں۔ "میری زندگی کا بیشتر حصہ یورپی فلسفے کے مطالعے میں گذرا ہے اور یہ نقطہ نگاہ میری فطرت ثانیہ
بن گیا ہے۔ شعوری یا غیر شعوری طور پر میں اسلام کے حقائق اور اس کی صداقتوں کا مطالعہ اس نکتہ نگاہ سے کرتا ہوں" یہی
خیالات ہمیں اقبال کی شاعری میں بھی نظر آتے ہیں۔

قوت مغرب نہ از چنگ و رباب نے ز رقص دختران بے حجاب
نے ز سحر ساحران لالہ روست نے ز عریاں ساق و نے از قطع روست

حکمی اورا نہ از لا دینی است ۔۔۔ نے فروغش از خطِ لاطینی است
قوت افرنگ از علم و فن است ۔۔۔ از ہمیں آتش چراغش روشن است
حکمت از قطع و برید جامہ نیست ۔۔۔ مانع علم و ہنر عمامہ نیست
علم و فن را اے جوانِ شوخ و شنگ ۔۔۔ مغز می باید نہ ملبوسِ فرنگ
اندریں رہ جز نگہ مطلوب نیست ۔۔۔ ایں کلہ یا آں کلہ مطلوب نیست

ہں سلیم اختر کا یہ سوال بہت اہم ہے کہ " آج اقبال کی تخلیقی زندگی کی پون صدی کے بعد ان کے انتقال کے چالیس برس بعد اور پاکستان کی تیس سالہ زندگی کے بعد ہمارے فکری رویئے علامہ کے فکری رویوں سے کس حد تک ہم آہنگ ہیں ؟ " میں سمجھتا ہوں کہ اس سوال کا تعلق صرف پاکستان کے ساتھ نہیں ہے بلکہ دنیا کے ہر اس ملک کے ساتھ ہے جہاں اقبال پر کام ہو رہا ہے ۔ خواہ وہ ہندوستان ہے، روس ہے، امریکہ ہے، فرانس ہے، یا جرمنی ہے اور حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔ دالی بات جو فاضل مصنف نے کی ہے وہ بھی صرف پاکستان ہی کے لئے نہیں ہے بلکہ ہر اس ملک کے لئے غور طلب ہے جہاں پوری سنجیدگی کے ساتھ اقبال کی دریافت نو پر کام شروع ہے ڈاکٹر سلیم اختر کا اقبال کے ایک شعر کے حوالے سے یہ کہنا کہ " افکار کی نظر بندی کے لئے ، پاکستان سے بڑھ کر بہتر غار اور کہاں دستیاب ہو سکتے ہیں " اس لیے صحیح نہیں ہے کہ اول تو پاکستان میں اقبال پر جو کام ہو رہا ہے اس سے اقبال کی شخصیت اور ان کے فکر و فن کے نئے آفاقی اور عالمی پہلو ابھریں گے ۔ اور اقبال عالمی کانگریس نے بحیثیت مجموعی جس رجحان کی طرف اشارہ کیا ہے اس کے بعد تو یہ امکانات اور زیادہ روشن ہو گئے ہیں اور دوسری بات یہ ہے کہ اقبال ایسے عظیم المرتبت شاعر کو صرف پاکستان سے وابستہ کرنا اتنی ہی زیادتی ہوگی ۔ جتنی شیکسپیئر کو صرف انگلستان کا شاعر کہنا یا گوئٹے کو جرمنی کا ۔ اور اقبال کے افکار کے از سر نو تجزیے اور ان کے نہفتہ اسرار تک رسائی کی کوشش میں ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں میں اقبال پر کام کرنے والے کی منزل ایک ہی ہے درویشِ خدامست نہ شرقی ہے نہ غربی !

آخر میں مجھے یہ کہنا ہے کہ یہ کتاب " اقبال اور ہمارے فکری رویے " اقبالیات کے موضوع پر ایک فکر انگیز کتاب ہے جو قدم قدم پر قاری کو سوچ بچار کی دعوت دیتی ہے ۔ پاکستان میں تو یہ کتاب چھپ ہی رہی ہے اگر یہ طباعت کے بعد ہندوستان آسکے تو اس کے مباحث اقبالیات کے تعلق سے یہاں بھی فکر و نظر کے زاویوں کو آگے بڑھانے میں ممد ثابت ہو سکتے ہیں

●

اے، بی اشرف

تنقیدِ اقبال کی ایک نئی جھلک

اقبال کی شخصیت اور فکر کی تشریح و توضیح عموماً اس فرسودہ اور گھسے پٹے انداز میں کی گئی ہے کہ نہ صرف یہ کہ اقبال کا اصل چہرہ گم ہو کر رہ گیا ہے بلکہ فکر اقبال کے خواب کی تعبیر بھی پریشان ہو کر رہ گئی اقبال کے نکھرے ہوئے سچے اور کھرے چہرے پر تقدس اور نور کا وہ نقاب ڈال دیا گیا کہ آنکھیں اقبال کی اصل صورت دیکھنے کو ترس گئیں کچھ لوگ نے نورِ روحانیت کا لبادہ اوڑھ کر اپنے اعمال کا کفارہ ادا کرنے کی خاطر کلام اقبال کے پل صراط سے گذرے لیکن میرا خیال ہے ان کے ہاتھ تو قلم نہ ہوئے پاؤں ضرور کٹ گئے البتہ اقبال کی وراثت کا دعویٰ انہوں نے کبھی نہ چھوڑا اور یوں انہوں نے بزعم خویش اپنی جنت پکی کر لی

ہر بوالہوس نے عشق پرستی شعار کی

اب آبروئے شیوۂ اہل نظر گئی

فکر اقبال کے آئینے میں ان لوگوں نے صرف ایک ماورائی اور مابعد الطبیعاتی نظام کی جھلک دیکھی۔ انہوں نے اپنے اعتقاد کی تعمیر کردہ مثالی دنیا کی تلاش کلام اقبال کے حوالے سے کی اور یوں سامنے کی زندگی کی حقیقتوں سے آنکھیں بند کر لیں اقبال کو سب سے زیادہ نقصان ان نام نہاد اقبال شناسوں نے پہنچایا ہے جو اقبال کے سرٹیفکیٹ سے تھرڈ کلاس کے الفاظ کھرچ کر اور ان کے والد محترم کے پیشہ درزی کو یا تو بالکل محو کر کے اور یا پھر زیادہ سے زیادہ خیاطی کا پیشہ کہہ کر اپنے کمپلیکس پر پردہ ڈالنے کی انتھک کوشش میں مصروف ہے اقبال سے ان نام نہاد شناساؤں کی دوستی کسی دشمنی سے کم نہیں۔

سلیم اختر کا یہ بیان حقیقت پر مبنی ہے کہ "مشرق کے آداب شرافت میں شخصیت پرستی کو بلا وجہ جو اساسی حیثیت حاصل ہو چکی ہے اس کے مضر اثرات نے شخصیت نگاری کو بالخصوص اور تنقید کو بالعموم متاثر کیا ہے جس کی وجہ سے تحریر میں سیرت کھاری سنہری مجموعات میں لپٹی خوش رنگ اور خوش نظر تو معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقت کے رنگ و بو سے عاری ہوتی ہے"۔ (۱)

علامہ اقبال کے پرستار بھی اس شخصیت پرستی کا شکار ہوئے اور نتیجہ یہ نکلا کہ نئی نسل کے سامنے نہ تو اقبال کی انسانی کمزوریوں سے پُر شخصیت آئی اور نہ ان کی ذات کی وہ خامیاں بے نقاب ہو سکیں جو ایک ڈائنامک (DYNAMIC) شخصیت کی آئندہ کامیابیوں کی محرک بنتی ہے۔ اقبال نے جن انسانی کمزوریوں کو اپنی پُرعظمت شخصیت کا کمپلیکس نہ بننے دیا۔ اقبال کے

---

(۱) "اقبال کا نفسانی مطالعہ" ۔ ص۔

نام نہاد ہوا خواہوں نے ان کمزوریوں کی پردہ پوشی کر کے نفلوں جتنا ثواب کمایا۔ ایک طرف تو یہ مجاہد تھے جنہوں نے کلام اقبال کے ہفت خواں طے کرنے کے کھوکھلے دعوے کئے لیکن پہلی ہی منزل پر تھک ہار کر بیٹھ گئے، دوسری طرف وہ سنجیدہ اور باشعور بادہ خوار اور رند مشرب لوگ بھی تھے جنہوں نے فکر اقبال کی تشریح و تعبیر معروضی رویوں کی روشنی میں کی۔ سچے اور کھرے چہرے والے اقبال کو تلاش کیا۔ مزدوروں کے دوست، قوت سے پُر، انقلاب کے داعی، خانقاہی زندگی کے نقاد، سرمایہ داری اور استحصالی نظام کے نکتہ چیں اس رند بادہ خوار کی تلاش کی جو مستی میں سچی بات کہنے سے کبھی نہیں چوکتا تھا۔ ان چند لوگوں میں عزیز احمد (اقبال نئی تشکیل)، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم (فکر اقبال) ڈاکٹر یوسف حسین خان (روح اقبال)، فرمان فتحپوری (اقبال سب کے لئے) خواجہ محمد ذکریا (اقبال کا ادبی مقام) ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار (اقبال کا ذہنی ارتقاء) پروفیسر محمد عثمان (حیات اقبال کا ایک جذباتی رنگ) نمایاں ہیں۔

آج میں اس فہرست میں ڈاکٹر سلیم اختر کے نام کا اضافہ کرتا ہوں جنہوں نے اقبالیات کے سلسلے میں خاصا وقیع کام کیا ہے۔ اقبال کا نفسیاتی مطالعہ، فکر اقبال کے منور گوشے، شعاع صد رنگ، اقبال کا ادبی نصب العین، اقبالیات کے نقوش ان کی تصنیف و تالیف کی ہوئی کتب ہیں لیکن اس وقت ہمارے پیش نظر ان کی اہم تصنیف "اقبال کا نفسیاتی مطالعہ" ہے جو اقبالیات کے سلسلے میں ایک فکر انگیز کتاب ہے۔

اس کتاب کے دو عنوان قائم کئے ہیں ایک شخصیت جس کے تحت اقبال کا نفسیاتی مطالعہ بھی کیا گیا ہے ان کی پہلی شادی اور خانگی زندگی کے واقعات کا تجزیہ بھی پیش کیا گیا ہے، اور ایک مضمون میں ڈاکٹر سلام سندیلوی کے اس موقف پر بحث کی گئی ہے کہ "اقبال نرگسی تھے"۔ پہلا مضمون اقبال کا نفسیاتی مطالعہ حاصل کتاب ہے اور غالباً اس لئے کتاب کا عنوان بھی اس مضمون کی نسبت سے رکھا گیا ہے۔ اس مضمون میں اقبال کی شخصیت پر لکھی گئی کتابوں، مکتوبات، نوٹ بک اور ڈائری وغیرہ کے حوالوں سے اقبال کو دریافت کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ جو کبھی "جوان ہوگا اور جس کے قلب و نظر اور ذہن متنوع اثرات کی آماجگاہ بھی بنے ہوئے ہوں گے۔"

اگر حالی سرسید ایسے ثقہ بزرگ کے کنکوے اڑانے کبوتر پالنے اور مجرے دیکھنے کا ذکر کر سکتا ہے اگر ڈاکٹر وحید قریشی، مولوی شبلی کی حیات معاشقہ لکھ سکتے ہیں تو سلیم اختر نے اقبال کا نفسیاتی مطالعہ کر کے کون سا گناہ کیا ہے کہ جس پر بری طرح برسا جائے (۱)۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے اس مضمون میں جو استدلال اختیار کیا ہے آسانی سے رد نہیں کیا جاسکتا۔ یہ مضمون سلیم اختر کے چند نہایت اہم مضامین میں شمار کئے جانے کے قابل ہے "کیا اقبال نرگسی تھے"؟ اپنی نوعیت کے اعتبار سے بڑا منفرد مضمون ہے اس میں ڈاکٹر سلام سندیلوی کے اقبال پر ایک مضمون کو بنیاد بنا کر خود داری، خود پسندی، خود شناسی، تعلی، تصوریت انا اور نرگسیت کی اصطلاحات کے فرق کو ڈاکٹر سلیم اختر نے بڑے منطقی انداز میں واضح کیا ہے کہ یہ دلائل اس نتیجے پر پہنچے کہ۔

"اقبال جو حرکت و جدوجہد کا شاعر ہے۔ جو وصل پر فراق کو اس لئے ترجیح دیتا ہے کہ یوں آرزو کا شعلہ فروزاں رہے گا۔ اور جو سعی مسلسل کی بنا پر جبریل پر ابلیس کو برتری دیتا ہو۔ اس اقبال کے اساسی تصور کو محض نرگسیت زدہ قرار دے کر اسے جنین دور کی طرف مراجعت کیسے کہا جاسکتا ہے؟"

---

(۱) - ملاحظہ ہو نعیم صدیقی کا مضمون .... سیارہ ڈائجسٹ

"اقبال کی پہلی شادی اور خانگی زندگی" کے تحت ڈاکٹر سلیم اختر نے مولانا سید حامد جلالی کی تالیف علامہ اقبال اور ان کی پہلی بیوی یعنی والدۂ آفتاب کے مندرجات کو بنیاد بنا کر اس پر استدلال کیا ہے اور استدلال کے لئے خالد نظیر صوفی کی تصنیف " اقبال درون خانہ" کے حوالے بھی دیئے ہیں۔

دوسرے حصے "فکروفن" میں کئی مضمون شامل ہیں جن میں پہلا " اقبال کا تنقیدی شعور" ہے اس مضمون میں اقبال کی تنقیدی بصیرت کا جائزہ بڑی تفصیل سے لیا گیا ہے۔ اقبال علم عروض کے علاوہ علم بیان اور اس کے دقیق مسائل سے بھی پوری طرح آگاہ تھے ان کے نزدیک شاعری مقصود بالذات نہ تھی حصول مقصد کا ذریعہ تھی وہ ادب برائے ادب کے قائل نہ تھے بلکہ ادب کی معاشرتی اور انقلابی حیثیت کے قائل تھے وہ ادب کو ایک حرکی عمل اور قوت جات میں اضافے کا باعث سمجھتے ہیں۔

۱۔ اقبال بھی "تلمیذ الرحمٰن" والے نظریہ کے قائل تھے۔ وہ شعر کو آمد کی پیداوار اور قلب کو شاعری کا مرکز سمجھتے تھے
۲۔ اقبال اصناف سخن کی قدیم تقسیم اور کلاسیکی معائیر کو نہ صرف پسند کرتے تھے بلکہ اس کو برقرار رکھنے پر اصرار بھی کرتے تھے
۳۔ اقبال زبان کو حرکی تصور کرتے ہوئے اس کی تغیر پذیری کو تسلیم کرتے ہیں۔
۴۔ مختلف قلوب اور طبائع پر شعر کے اثرات مختلف ہوتے ہیں۔

" تو شب آفریدی چراغ آفریدم" میں اقبال کے تصورِ فن کا تجزیاتی مطالعہ کیا گیا ہے " حالی اور اقبال کے مقامات آہ و فغاں"، " غزل میں نئی جہت۔ اقبال" " اقبال کی نثر کا مزاج"، " کیا آج اقبال کی ضرورت ہے" ...... یہ سب مضامین اقبالیات کے مطالعہ میں ایک نئی جہت کا اضافہ ہیں۔

ڈاکٹر سلیم اختر نفسیاتی نقاد ہیں۔ اور نفسیاتی نقادوں کے یہاں کبھی کبھی الجھاؤ پیدا ہو جاتا ہے کیونکہ ضروری نہیں کہ ہر تجزیہ صحیح نتائج پر منتج ہو۔ ڈاکٹر سلیم اختر کے ان مضامین کا مطالعہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ ان کا ذہن اپنے موقف کے سلسلے میں بالکل واضح اور صاف ہے وہ جو بات کہنا چاہتے ہیں بڑی صفائی سے کہہ جاتے ہیں لگی پٹی نہیں رکھتے نہ اسے نفسیات کی گراں بار اصطلاحات سے بوجھل بناتے ہیں انہوں نے اقبال سے محض اپنی عقیدت کا اظہار نہیں کیا بلکہ ایک متوازن اور دیانتدار ناقد کی طرح اپنی مثبت اور منفی رائے بڑی بے باکی سے دے دی ہے لیکن کہیں ایک جگہ بھی احترام میں فرق نہیں آیا " اقبال کی نثر کا مزاج" میں لکھتے ہیں۔

> "اقبال کی نثری کاوشوں کے تجزیاتی مطالعے سے پیشتر اس حقیقت کا ذہن نشین رکھنا لازم ہے کہ موضوعات اور مسائل کے اعتبار سے ان میں سے بیشتر ایسے مقالات ہیں۔ جن کی آج چنداں اہمیت نہیں۔ میرا مطلب ہے۔ اقبال کے نام سے الگ کر کے بطور ایک واحد مضمون کے"۔ (۱)

اسی طرح اقبال کے ناقدانہ صلاحیتوں کے بارے میں ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں۔

> "نہ اقبال نے ادبی تنقید کو کوئی نیا نظریہ دیا اور نہ ہی اپنے تنقیدی مباحث کی روشنی میں ہم عصر ادب کی نشریہ و تحلیل کی۔ اس طرح خطوط یا متفرق مضامین سے اقتباس جمع کرنے کے باوجود بھی ان میں وہ ربط و ضبط نہ ملے گی۔ جو کسی باضابطہ تنقیدی مضمون کی خصوصیت ہوتی ہے لیکن بکھرے بکھرے خطوط میں یہ

---

(۱) اقبال کا نفسیاتی مطالعہ۔ ص۔ ۲۲۷

بکھرے بکھرے خیالات ایسے اشارات کی صورت یقیناً اختیار کر جاتے ہیں جنہیں بلا جھجک اقبال کے تنقیدی شعور کی تفہیم کے لئے اشارئے قرار دیا جا سکتا ہے۔" (۱)

سلیم اختر کا اسلوب بڑا واضح سادہ اور سائنٹیفک ہے اس میں نہ تو الجھاؤ ہے نہ خشکی نہ بے جا آرائش۔ اس میں اظہار و ابلاغ کی خوبی ہے، وضاحت ہے حسن ہے اور بات کہنے کا سیدھا انداز ہے۔ شلاً

"بحیثیت مجموعی اقبال کے نظریۂ ادب کا جائزہ لیں تو واضح ہوگا کہ اس کے خمیر میں مشرقی شعری روایات کوٹ کوٹ کر بھری ہیں۔ لیکن وہ ان روایات و مسلمات کے اندھے پجاری نہیں بنے بلکہ یہ روایات، یہ کلاسیکی معاییر، یہ شعری سانچے اور یہ قدیم اسالیب سب ان کے ماہر ہاتھوں میں گویا گیلی مٹی بن جاتے ہیں اور اقبال ایک ماہر فن کوزہ گر کی مانند ان سے دلکش جام و مینا بناتے ہیں اور اسی میں اقبال کی عظمت کا راز ہے" (۲) یا

"فن کار کی منزل محض فطرت کو سرمندہ کرنا نہیں اور نہ فطرت کی غلامی سے ہنر کو آزاد کرانا اس کا منصب ہے کیونکہ اقبال اس کے لئے زیادہ بلند مقام دیکھتا ہے یہ وہ مقام ہے جہاں انسان اپنی تخلیق سے فطرت کا ضیاع دینے کے بجائے فطرت کو زیر کرتا اور اس کی کمی کا توڑ دریافت کرتا ہے یہ وہ مقام ہے جہاں انسان تخلیقی صلاحیت اعجاز ہنر کی صورت میں اسے خدا کی سطح تک لے آتی ہے" (۳) یا

"اقبال نے قوم کے لئے جو لائحہ عمل تجویز کیا ہے اس کی ترسیل کے لئے تنگنائے غزل موزوں نہ تھی غزل میں جو انتشار فکر ہے وہ زندگی جرعہ جرعہ پینے کے مترادف ہے جبکہ زندگی کے سمندر میں ڈوبنے والے کے لئے تو غزل سمندر سے پیاسا کو شبنم ملنے والی بات بن جاتی ہے۔ اس لئے وہ نظم نگاری کی طرف مائل ہوا بلکہ نظم مزاج میں یوں رچ گئی کہ بیشتر غزلیں بھی مسلسل ہو کر نظم ایسی صورت اختیار کر گئیں ہمارے قدیم شعرا نے بھی بعض اوقات مسلسل غزلیں کہیں، ہیں لیکن ان کے نفسی محرکات جداگانہ تھے وہاں جذبے کا دریا جب دو مصرعوں کے کوزے میں بند نہ ہو سکا تو سیلاب میں کناروں سے چھلکتے دریا کی مانند پھیل کر مسلسل غزل کا روپ اختیار کر گیا" (۴)

آخر میں اس کتاب کے بارے میں ڈاکٹر سید عبداللہ کی قیمتی رائے درج کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ۔۔

"شخصیت اقبال کا نفسیاتی تجزیہ سلیم اختر کی انسان دوستی کا زندہ ثبوت ہے علامہ اقبال کی مرتبہ شناسی اور اعتراف کے ساتھ ساتھ بہ حیثیت انسان ان کے خصائص و ذوق کا سراغ لگایا گیا ہے اور جلوت کے ساتھ خلوت کے احوال سے بھی روشناس کرایا ہے۔۔۔۔ ۔۔۔ ۔۔۔ اقبال کے متعلق لکھی جانے والی نئی کتابوں میں سلیم اختر کی یہ کتاب ارمغان فکر سے کم نہیں"۔ (۵)

---

(۱) ۔ اقبال کا نفسیاتی مطالعہ ۔ ص ۔ (۱۰۷)
(۲) ۔ " " ۔ ص ۔ (۱۳۷)
(۳) ۔ " " ۔ ص ۔ (۱۶۲)
(۴) ۔ ص (۱۹۳)
(۵) بحوالہ فلیپ اقبال کا نفسیاتی مطالعہ

احمد ندیم قاسمی

اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ

کسی بھی زبان کی تاریخِ ادب سے بہت کم افراد کو شناسائی حاصل ہوتی ہے صرف متخصصین ہی تاریخ ادب پر حادی ہوتے ہیں ادب تخلیق کرنے والوں میں سے بیشتر ادب کی تاریخ کھنگالنے کے جھنجھٹ میں نہیں پڑتے پڑھے لکھوں کی عام رائے کے مطابق یہ کام صرف محققین یا پھر ناقدین کا ہے تاریخ ادب سے اس بے اعتنائی کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ اس کا مطالعہ عموماً صرف ضرورتاً کیا جاتا ہے اور پھر تاریخ ادب کی کتابیں اتنی بھاری بھرکم ہوتی ہیں کہ ان کے مطالعے کا حوصلہ کم ہی لوگ کر پاتے ہیں ڈاکٹر سلیم اختر کو نہ جانے کیا سوجھی اور کیسے سوجھی کہ انہوں نے اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ لکھ کر اسے ایک ناول افسانوں کی ایک کتاب اشعار کے ایک مجموعے کی طرح گھر گھر پہنچا دیا اور اس کتاب کی برکت سے آج ادب کا ایک عام قاری بھی تاریخ ادب کی بنیادی معلومات سے مسلح ہے ڈاکٹر سلیم اختر کی اس اپج کا پس منظر یہی ہو سکتا ہے کہ وہ ادب کے استاد بھی ہیں اور ادیب بھی وہ ادب کے صرف استاد ہوتے تو مختصر ترین تاریخ لکھنے کا خیال ان کے ذہن میں شاید ہی پیدا ہو سکتا مگر وہ ادیب بھی ہیں چنانچہ وہ ادب کی تاریخ کو تحقیق و تنقید کی چوٹیوں پر سے اتار کر نیچے وادیوں میں لے آئے اور اسے عوام الناس سے روشناس کرایا۔ بحیثیت ادیب انہیں معلوم تھا کہ ہر شخص تحقیق کی کوہ پیمائی پر قدرت نہیں رکھتا اس لئے ان دشوار گذار پگڈنڈیوں سے بچ کر نکل جاتا ہے مگر ہر اس شخص کو جسے ادب سے ذرا سا بھی شغف ہے تاریخ ادب کے عنوانات اور چیدہ چیدہ واقعات سے لازماً باخبر ہونا چاہیے کہ ادب صرف حال کی چیز نہیں ہے وہ ماضی سے کسب فیض نہ کرے تو اس کا حال بے معنی ہو کر رہ جائے۔ چنانچہ ڈاکٹر سلیم اختر نے اردو ادب کی ضخیم کتابوں کا عرق کشید کرنے کی ٹھانی اور اس عرق کو اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ میں منتقل کر دیا

تاریخ سیاست کی ہو، تمدن کی ہو یا ادب کی، اس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ہر مورخ بار بار دہرائے ہوئے واقعات کو اپنے اسلوب میں ایک بار پھر دہرا دیتا ہے اور مصنف کہلاتا ہے میں سمجھتا ہوں کہ علم تاریخ کے بارے میں یہ اعلان طوفانی نوعیت کا ہے ہر مورخ تاریخی واقعات کا تجزیہ اپنی منفرد سوچ اور منفرد نظریے کی روشنی میں کرتا ہے اور تاریخ صرف واقعات کا نام نہیں ہوتا۔ واقعات کے اثرات کا تجزیہ بھی تاریخ ہی کا حصہ ہے بلکہ وہ زیادہ معتبر اور وقیع حصہ ہے ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنی کتاب کے نہایت مختصر کینوس میں بھی اپنی سوچوں اور اپنے نظریات کے پھول جا بجا کھلائے ہیں تاریخ کی تفصیلات کے مقابلے میں ڈاکٹر سلیم اختر نے اجمال کا جو انداز اختیار کیا ہے وہ نہایت دلآویز ہے پڑھنے والا ان سے اختلاف بھی کر سکتا ہے مگر بدمزہ نہیں

ہو سکتا کیونکہ مصنف کی آواز صاف ہے اور اس کے لہجے میں اعتماد ہے

کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے مجھے محسوس ہوا کہ دور حاضر کے ادب کی تاریخ لکھتے ہوئے ڈاکٹر سلیم اختر کو بڑی آزمائش کا سامنا رہا ہے معاصر ادب اور ادیبوں کے بارے میں کھری بات کہنے کا حوصلہ بڑے بڑے جغادری نقادوں کو بھی نہیں ہو پاتا ڈاکٹر سلیم اختر بھی تاریخ کے اس مرحلے تک پہنچ کر بار بار ٹھٹکے ہیں مگر ہر بار ان کی دیانت ان کا سہارا بنی ہے اور وہ دو ٹوک انداز میں اپنا فیصلہ سنا کر آگے بڑھ گئے ہیں آج ان فیصلوں پر چاہے ہزار جرحیں کی جائیں مگر مستقبل کا ادبی مورخ تسلیم کرے گا کہ ڈاکٹر سلیم اختر ایک جری محقق و ناقد تھا کیونکہ اس نے کذب و منافقت کی تاریکی میں بھی صداقت و دیانت کی مشعل بلند کی

ڈاکٹر وحید قریشی

اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ

اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ دس سال قبل پہلی بار شائع ہوئی تھی زیر نظر طباعت اس کتاب کا آٹھواں ایڈیشن ہے جس میں تغیر تبدل، حک و اصلاح اور ترمیم و اضافے کا عمل اس طرح ہوا ہے کہ اب یہ ایک نئی کتاب بن گئی ہے۔

اردو زبان و ادب کے آغاز سے عصر حاضر تک کا سفر ایک طویل اور انوکھا سفر ہے طویل زمانی اعتبار سے اور انوکھا اس لحاظ سے کہ جو کام ایک ادارے کے کرنے کا تھا اسے ایک فرد واحد انجام دینے کے درپے ہے۔ تاریخ ادب کا مشکل مرحلہ وہ ہے جس میں نقاد پورے ادبی تناظر کو سامنے رکھ کر ہر دور اور اس کے ادب پاروں کا تجزیہ کرتا ہے۔ شخصیتوں کی طرح ہمارے ہاں تاریخ ادب بھی دو حصوں میں بٹ چکی ہے کچھ نقاد و محقق وہ ہیں جو ۱۸۵۷ء سے پہلے کے ادب کو ادب مانتے ہیں کچھ وہ ہیں جو اپنی نسل کے سوا کسی کو مانتے ہی نہیں نتیجہ یہ ہے کہ ان کی تحریریں جزوی حقائق کے جزوی مطالعے پر مرکوز ہیں اور ادب کا پورا منظر نامہ ان کے مطالعے کی زد سے باہر ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر جدید ادب کے مزاج داں بھی ہیں اور قدیم ادب کے طالب علم بھی ہیں اس لئے ان کے ہاں پوری ادبی تاریخ کو ایک ہی نقطۂ نظر سے دیکھنے اور تسلسل اور تواتر کی مدد سے اخذ نتائج کا شعور بھی ملتا ہے وہ بنیادی طور پر نفسیاتی نقاد ہیں لیکن تاریخ ادب کی تحریر کے لئے سماجی احوال کے تجزیئے کی ضرورت نے انہیں فرد اور معاشرے کے باہمی ارتباط کا احساس بھی دلا دیا ہے اس لئے انھیں نفسیاتی تنقید کے ساتھ تحقیقی حوالوں سے سماجی اور فکری رویوں کی پہچان کا ملکہ آ گیا ہے اس اعتبار سے انہوں نے جدید ادب کے پروفائل یا یک رخے زاویۂ نظر کی بجائے وسیع تر پس منظر کو سامنے رکھا ہے آغاز سفر میں انہوں نے جدیدیت کے تجزیاتی مطالعے اور قدیم ادب کے مطالعے کے درمیانی خلا کو اختصار پسندی کے دامن میں چھپا یا تھا لیکن دس سال میں ان کے ہاں قدیم ادب کو امکانی حد تک اپنی گرفت میں لینے ہی کامیابی ہوئی ہے اور اب یہ تاریخ ادب محض تاریخ ادب ہے اور مختصر ترین کی صفت اس کا نقطہ تجارتی نشان ہے۔

کتاب سترہ ابواب اور دو ضمیموں پر مشتمل ہے اور فاضل مقالہ نگار اسے ۱۹۸۱ء تک لے آئے ہیں ان میں سب سے زیادہ نازک مقام وہ ہیں جہاں اپنے معاصرین کے بارے میں اظہار رائے کیا گیا ہے سلیم اختر جو قدیم ادب کے تجزیئے میں محتاط طرز اختیار کرتے ہیں بعض اوقات معاصرین کے بارے میں تند و تیز فقروں چبھتے ہوئے انداز بیاں اور پھبتیوں سے بھی کام لیتے ہیں جس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ پوری تاریخ میں ہموار اور یکساں روش اختیار کرتے وقت اور عمر کا بڑا دخل ہے

خصوصاً معاصر ادب میں معروضیت کی تلاش و جستجو ابھی اپنے اندر کئی مزید امکانات رکھتی ہے۔
سلیم اختر نے ادبی تاریخ کی تحریر میں مواد کی جمع آوری اخذ نتائج اور فکری جہت کے تعین میں جو محنت اٹھائی ہے۔ اس کی داد تو ان کے مخالفین بھی دیتے ہیں ورنہ اسے یکسر نظر انداز کر دیتے اس محنت اور انہماک نے ان کے مطالعے کو زیادہ وسعت دی ہے اس سے وہ قدیم و جدید کو نقطۂ ارتکاز کے حوالے سے دیکھنے میں کامیاب ہوتے ہیں قدیم میں ان کا مزاج کے اعتبار سے رومانی تحریک کے زیادہ قریب ہے اگرچہ اپنی تاریخ میں انہوں نے رومانی تحریک کے مقابلے میں ترقی پسند تحریک کو زیادہ اجاگر کیا ہے اور اس کے اثرات کی تلاش میں دور جدید تک وہ ایک متوازن ویژن سے آتے ہیں اور رومانی دور کی دلچسپیاں سمٹ سمٹا کر ان کے اپنے اسلوب تک محدود ہو گئی ہیں انہوں نے بعض مقامات پر مبالغے کا وہ پیرایہ بھی اپنایا ہے جو رومانی نقادوں سے خاص ہے۔ مثلاً

(۱) ورٹ ولیم کالج میں اس مقصد کے لئے ہندوستان بھر کے اہل علم اور اہل قلم کلکتہ میں جمع کر لئے گئے
(۲) غالب کی رمزیت نے ان کی شاعری میں عجیب عجیب گل کھلائے ہیں
(۳) بانگ درا کی بہت سی غزلوں اور باقیات اقبال کے بے شمار اشعار میں داغ کے شعوری تتبع کے سراغ مل جاتے
(۴) تشریحی نقاد کبھی بھی اپنی رائے نہیں دے گا دوسروں کے کہے پر انحصار کرے گا۔
(۵) آریائی ہندوستان میں بھی دربار کی سرپرستی کی بنا پر ڈرامے نے بے حد ترقی کی اور اس کے لوازمات پر ہر ممکن زاویے سے روشنی ڈالی گئی۔
(۶) عارف کی کتاب تنقید کی بہت اچھی مثال ہے معتدل رویہ خوب اپنایا ہے
(۷) محمد کاظم کی واحد کتاب ہے اور خوب ہے۔

اس رنگ و روپ میں سلیم اختر بعض اوقات محمد حسین آزاد کا انداز بھی اختیار کرتے ہیں۔
"جدید نظم کا ایک جنگل ہے جس میں نثری نظم کی پگڈنڈی کسی نامعلوم منزل کو جاتی ہے ۔۔۔ پاس ہی کچھ لوگ ایول لگائے چہروں کے خاکوں میں رنگ بھر رہے ہیں۔ ۔۔۔ ان سب سے الگ انشائیے کا جوہڑ ہے جہاں کوے آپس میں لڑتے ہیں اور نقلی چوکیدار کسی کو پانی نہیں پینے دیتا۔"
رومانی اسلوب کے ان نمونوں کے علاوہ سلیم اختر کا عام اسلوب بھی اک ذرا مبالغے کی طرف مائل ہو گیا ہے چنانچہ ان کی تحریروں میں ' بہت ، بہت سا ، خوب ، بہت خوب کی کثرت کھٹکنے لگتی ہے ساغر صدیقی کے بارے میں فرماتے ہیں
"ساغر صدیقی ایک بہت اچھا اور مخصوص طرز ادا کا حامل شاعر ہے جسے ہم عصر ناقدین نے قطعی طور پر نظر انداز کر دیا ہے حالانکہ وہ بے پناہ تخلیقی صلاحیتوں کا مالک ہے"
سلیم اختر کے اسلوب کی یہ خامی شاید اس وجہ سے ہے کہ ابھی انہوں نے اپنی کتاب کے اس پہلو کی طرف توجہ نہیں کی ورنہ اس میں " ویسے " " بہر حال " وغیرہ الفاظ اس قدر کثرت سے نہ آتے۔ امید ہے کتاب کے اگلے ایڈیشن میں وہ زبان و بیان کی تبدیلیوں کی طرف بھی توجہ فرمائیں گے جس طرح انہوں نے اپنی آراء کو مزید غور و خوض کے بعد بدلنے کا حوصلہ کر لیا ہے اس طرح اپنی عبارت کے اس پہلو پر بھی نظر ثانی فرمالیں گے تو مناسب ہو گا۔ آراء کو بدلنے کی بات چلی ہے تو یہ کہنے میں بھی ہرج نہیں کہ سلیم اختر کے بعض معاصرین تاریخ ادب کے بدلتے ہوئے مطالب کو ان کی غیر مستقل مزاجی پر دال کرتے

ہیں لیکن میرے نزدیک یہی ان کی بڑائی کی علامت ہے۔ جدید ادب کے مطالعے میں قربِ زمانی کی وجہ سے بعض اوقات اخذ نتائج میں دھوکا بھی ہو جاتا ہے کبھی ہم اپنے کسی معاصر سے زیادہ توقعات وابستہ کر لیتے ہیں اور اس کا آئندہ کا تحریری سرمایہ اس کی نفی کر دیتا ہے کبھی مزید مطالعہ اور غور و خوض پہلی رائے میں ترمیم یا تنسیخ کا تقاضہ کرتا ہے کبھی جدید ترین تحریکات کا سماجی سیاق و سباق بہت دیر میں کھلتا ہے کبھی جذباتی رویے بھی اس پہچان میں رنگ دکھاتے ہیں معاصرین کے بارے میں پوری طرح معروضی بن جاتے ہیں غور و فکر کے جس آشوب سے گذرنا پڑتا ہے سلیم اختر دس سال سے اس عذاب سے دوچار ہے۔ اس کی فکری دند گی جمود کا شکار نہیں اس لئے اسے اپنے سابقہ فیصلوں کے بدلنے میں بھی کوئی عار یا دشواری نہیں۔ اس کتاب کی یہ اساسی خوبی ہے۔ کر لکھنے والے نے اپنی بعض غلط آراء کو بدل دیا ہے اور نئے ایڈیشن میں سابقہ عبارات پر نظر ثانی کی ضرورت اور اہمیت کو تسلیم کیا ہے یہ تو اس کی بڑائی کی دلیل ہے کہ وہ بزرگ ترقی پسندوں کی طرح اپنی پرانی آراء کی تکرار اور ان کی نئی نئی تاویلات نہیں کرتا۔ جسے غلط جان لیتا ہے اسے رد کر دیتا ہے۔ یہ تبدیلی اس کے ہاں جذباتی رویے اور منافقت کی بنا پر نہیں ہوتی مزید مطالعے اور مزید مواد کی بنا پر ہوتی ہے ذہنی ارتقاء کے دشوار مرحلوں کو سلیم اختر نے ایک ماہر نفسیات کی طرح چیلنج کے طور پر قبول کیا ہے اور یہی ان کی کتاب کی مقبولیت کا اصل سبب ہے۔

اور اب کتاب کا مطالعہ ایک دوسرے پہلو سے پیش کیا جاتا ہے۔ تاریخ ادب ادبی تعبیر و تشریح اور تجزیے کا عمل ہی نہیں مواد کی چھان پھٹک اور قاری تک درست مطالب کی ترسیل کا وسیلہ بھی ہے سلیم اختر اپنے قاری کو اس لحاظ سے بھی مایوس نہیں کرتا وہ اپنے گرد و پیش لکھی جانے والی تحقیقی کتابوں کو پیش نظر رکھتا ہے اور جہاں اسے کوئی نیا مسئلہ ملتا ہے اسے وہ اپنی کتاب میں شامل کر لیتا ہے تاہم چونکہ تحقیق اس کا اصل میدان نہیں اس لئے اس نہج سے بعض جگہ اغلاط کی موجودگی دیکھنے میں آئی ہے۔

امید ہے ڈاکٹر سلیم اختر آئندہ ایڈیشن میں ان چھوٹی چھوٹی غلطیوں کی تصحیح بھی کر لیں گے۔ کتاب مجموعی اعتبار سے اہم ہے اور یہ نیا ایڈیشن سابقہ ایڈیشن پر اضافے مواد اور تجزیے کے اعتبار سے بازی لے گیا ہے۔

●

اصغر ندیم سیّد

اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ

یورپ میں جب کل تحقیق کا جو جدید انداز رائج ہے اس میں محقق کو مواد جمع کرنے کے لیے وقت ضائع کرنا نہیں پڑتا۔ اسے مختلف ذرائع سے یہ کام کیا کرایا مل جاتا ہے وہ اس کی روشنی میں اپنی صلاحیتوں کا بہتر استعمال کر سکتا ہے۔ ہمارے ہاں تحقیق میں سارا زور جوتیاں چٹخانے پر صرف کر دیا جاتا ہے اور یہی سب سے معتبر کام گردانا جاتا ہے چاہے سر کے اوپر کا خانہ اس سلسلے میں بالکل استعمال نہ کیا گیا ہو۔

ڈاکٹر سلیم اختر RADICAL محقق اور نقاد ہیں انہوں نے اس روایتی راستے کو چھوڑ کر جدید تحقیق کی طرح ڈالی ہے جس کے مطابق غیر ضروری تفاصیل اور سدھد کی کوڑیاں ادب کے طالب علموں کی ذہنی پرداخت اور تخلیقی اپچ میں رکاوٹ بن سکتی تھیں اس لئے ادب کی تاریخ کو واضح نتائج کے ساتھ ایک زمانی اور موضوعاتی ترتیب کے ساتھ اس طرح پیش کیا جائے کہ ادب شناسوں کو ایک واضح خاکہ بھی مل جائے اور اس پر سوچنے اور رائے دینے کے لئے گنجائش بھی چھوڑ دی جائے "اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ" اس اہم ضرورت کے پیش نظر لکھی گئی ہے یہ ان تاریخوں سے قطعی مختلف ہے جو حتمی محاکمے جاری کر کے مہر لگا دیتے ہیں ڈاکٹر سلیم اختر نے نئے ذہن اور فکر کے حامل نقادوں کے لئے مختلف راستے پیدا کئے ہیں کہ وہ اپنی ذاتی رائے کے رنگ سے اس خلا کو بھر سکتے ہیں۔

"اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ" کو متنازعہ صیغۂ ادب میں جائز مقام ملا ہے۔ کتاب کے دیباچے میں مصنف نے کچھ اسباب کی طرف اشارے بھی کئے ہیں اصل میں اسے متنازعہ فیہ ہونا بھی چاہیئے کیونکہ اردو ادب میں پہلی مرتبہ ہم عصر ادب کی تاریخ مرتب کرنے کی کوشش کی گئی ہے ہم عصر ادب جس بحران کا شکار ہے اس کی ایک وجہ اس کتاب کے متنازعہ فیہ ہونے سے بھی ہماری سمجھ میں آ سکتی ہے۔ مختلف ٹکڑیاں اپنی لبا طکے مطابق خوش فہمیوں میں مبتلا ہیں ڈاکٹر سلیم اختر کا یہ حق ہے کہ وہ قاری کو اس عہد کے ادب کی ایک تصویر دکھائے اب اس تصویر میں کسی کو اپنا قد چھوٹا نظر آتا ہے تو اسے کوتاہ نظری بھی کہا جا سکتا ہے اس لئے کہ ادیب جس وسعت نظری کا ڈھنڈورا پیٹتے رہتے ہیں اس کا امتحان اس کتاب میں ہو جاتا ہے صورت حال یہ ہے کہ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر ان کا نام کسی فہرست میں آنے سے رہ جائے گا تو ان کے ادب کی عمارت دھڑام سے گر جائے گی۔ ایسے لوگوں کا نام واقعی فہرست میں شامل نہیں ہونا چاہیئے اگر کسی کو اپنے فن پر اعتماد نہیں ہے اور وہ ا ن

سہاروں کی تلاش میں پھرتا ہے کہ کسی مضمون میں اس کا ذکر ہوا ہے یا کسی میں نہیں ہوا۔ تو ایسے ادیبوں کے لئے کسی تاریخ میں جگہ نہیں ہونی چاہیئے اس معاملے میں ڈاکٹر سلیم اختر کے بنائے ہوئے خاکے کو درست سمجھنا چاہیئے کہ انہوں نے واقعی ایسے لوگوں کا ذکر کیا ہے جو مستحق تھے اور جن کو نظر انداز کیا ہے وہ اسی لائق تھے اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ ایک تاریخ ہے کوئی سرٹیفکیٹ نہیں ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر گذشتہ کئی برسوں سے ادبی میدان میں بطور نقاد اور قاری کی طرح ہر قسم کی سرگرمیوں میں شامل رہے ہیں ان کے سامنے ہر قسم کی تحریک یا رویہ پروان چڑھتا یا بکھرتا رہا ہے اس لئے ہمیں ان کی یادداشت پر شبہ نہیں کرنا چاہیئے اور نہ ہی نیت پر شک کرنا چاہیئے کیونکہ وہ ہر مکتبِ فکر میں اپنی محنت اور صلاحیت کی وجہ سے یکساں مقبول رہے ہیں وہ اگر یہ کتاب نہ بھی لکھتے تو ان کا مرتبہ بہت محفوظ تھا بلکہ اس کتاب سے ذاتی طور پر وہ کچھ الجھنوں کا شکار بھی ہوئے ہیں اور اس کتاب سے انہیں فائدے کی بجائے ذرا سا نقصان بھی ہوا ہے لیکن یہ ایسا کام تھا جو نہ تو کسی نے کرنا تھا اور نہ ہی کوئی سنجیدہ محقق اس طرف متوجہ ہوتا اس لئے ڈاکٹر صاحب کے اس کام کو اہمیت کی نظر سے دیکھنا پڑتا ہے۔

اب ہم اس کتاب کے منفرد پہلوؤں کا جائزہ لیتے ہیں

ابتدائی حصے میں اردو ادب کی کلاسیکی تاریخ جو بے شمار صفحات پر بکھری پڑی تھی اسے ایک جگہ اجمالی طور پر جمع کر کے اردو کے سفر کے نشانات کو ابھار دیا ہے۔ اب یہ سفر صاف رستے پر دکھائی دیتا ہے اس سلسلے میں ڈاکٹر صاحب نے معتبر حوالوں کے ساتھ ساتھ اپنی دریافت پر بھروسہ کیا ہے ایسا ہی ہونا چاہیئے تھا کہ ان کے نقاد ہونے کا فائدہ بھی اس کتاب میں نظر آنا ضروری تھا بے شمار مغالطوں سے وہ اس طرح بچ گئے ہیں کہ جدید تحقیق کے نتائج ان کے سامنے تھے اس لئے باقی تاریخوں کے مقابلے میں اسے ہم جدید بھی کہہ سکتے ہیں کلاسیکی حصے پر کسی کو کوئی اعتراض ہی نہیں ہے کہ اس میں حقائق ہیں جن سے روگردانی نہیں کی جا سکتی تاہم ادبی تاریخ کے بعض اہم رویے اور واقعات جو باقی مؤرخوں کی نظر میں اہم نہیں بن پائے تھے وہ پہلی مرتبہ اپنے اصل سیاق و سباق میں اجاگر کیے گئے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کا اصل کمال وہاں سے شروع ہوتا ہے جہاں سے ادب نے نئی فکر اور نئی تازگی حاصل کی۔ حالی کے بعد ادب میں جو رویے اور نظریے پیدا ہوئے ان کی لہروں کا سفر دور دور تک جاتا ہے اور پھر ترقی پسند تحریک کے ساتھ ساتھ ادب میں مغربی ادب کے اثرات جس طرح وارد ہو رہے تھے ان کی تفصیل بھی تاریخ کا حصہ بننا چاہیئے تھے جو اس سے پہلے ہمیں اس طرح ایک جگہ نظر نہیں آتی۔ تاریخیں افراد کو اہمیت نہیں دیتیں۔ افراد تنکوں کی طرح وقت کی لہروں کی نذر ہو جاتے ہیں لیکن ادب تو انہی افراد کے دم قدم سے قائم ہوتا ہے یہ انفرادی تجربے ہی تحریک بنا لیتے ہیں دبستان تاریخ نہیں بناتے دبستان انفرادی تجربوں کی بجائے اجتماعی رویے کی ترجمانی کرتے ہیں جبکہ انفرادی تجربے بڑا ادب پیدا کرتے ہیں ڈاکٹر سلیم اختر نے ان لوگوں کو ادب کی تاریخ سمجھا ہے جنہیں تنہا سمجھ کر نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے متوازن اور معتدل مزاج کی وجہ سے افراط و تفریط کا شکار ہوئے بغیر ادب کی ہر صنف کو مختلف ادوار کے سفر سے گذارا ہے اور ہر عہد میں اس کی صورتحال سے اجتماعی نفسیات اور تہذیبی دھاروں کا پتہ چلایا ہے ادب کی تاریخ صرف ناموں سے مرتب نہیں ہونا چاہیئے بلکہ اس کے تہذیبی ثقافتی سیاسی سماجی اور نفسیاتی عوامل کی تاریخ بھی ساتھ ہی مرتب ہونی چاہیئے ایسا کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے تجزیاتی انداز بھی اختیار کیا ہے اور ادب کو زمانے کے اندر رکھ کے اس کی شناخت کی ہے۔

کتاب کو کہیں تو زمانی اعتبار سے کہیں موضوعاتی اعتبار سے اور کہیں رجحانات کے لحاظ سے تقسیم کیا گیا ہے اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کوئی عہد زمانی لحاظ سے اہم ہوتی ہے کوئی موضوعاتی لحاظ سے اور کوئی رجحان کی وجہ سے اہم ہوتی ہے۔ میرا خیال ہے ان تینوں حوالوں سے جب ادب کا جائزہ لیا جائے گا تو مشکل سے کوئی نشان نظر سے اوجھل ہو سکتا ہے۔

مصنف کتاب کے آخری حصے میں مشکل دور میں داخل ہو جاتا ہے اپنے ہم عصر ادیبوں کا جائزہ لینا یقیناً نازک کام ہے۔ راستے کا پہلا پتھر خود مصنف کی ذات ہے جس کی اپنی پسند ناپسند بھی ہے اور ادب کا انفرادی ذوق بھی اس لئے اس مرحلے سے غیر جانبداری سے گذرنا مشکل کام ہے لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب نے بہت کم شکایت کا موقع دیا ہے اور اس میں بھی ان کے تعصب کو دخل نہیں ہے یہ انسانی مجبوری ہو سکتی ہے اس رکاوٹ سے گذرنے کے بعد سب سے بڑا مسئلہ مصنف کے لئے یہ تھا کہ ملک میں بے شمار ادیب اور بے شمار چھوٹے بڑے ادبی پرچے اور اخبار موجود ہیں جن میں بے شمار لوگ لکھ رہے ہیں یہ بات تو سبھی جانتے ہیں کہ ہر دور میں زیادہ لوگ ایسے ہوتے ہیں جنہیں تاریخ اپنے دامن میں مشکل سے جگہ دیتی ہے وہ بڑے فنکاروں کے لئے کھاد کا کام دیتے ہیں ان میں سے ایک بڑا EMERGE ہوتا ہے لیکن وقت سے پہلے جب کسی عہد کی تاریخ لکھی جائے گی تو ہر آدمی اپنی شمولیت پر مُصر نظر آئے گا اس لئے کوئی نہ کوئی معیار قائم کرنا ضروری تھا ڈاکٹر صاحب نے اردو کے معتبر اور غیر متنازعہ فیہ ادبی پرچوں کو اس سلسلے میں معیار بنایا ہے جو میرے نزدیک اس مسئلے کا واحد حل تھا بعض ادیب ایسے بھی ہوتے ہیں جو تقریباً ہر پرچے میں شائع ہوتے ہیں لیکن ان کی انفرادیت یا تخلیقی اپج نہیں ہوتی ایسے ادیبوں کے ذکر سے کوئی بھی نہیں بچ سکتا۔ ڈاکٹر سلیم اختر بھی نہیں بچ سکے۔ اس حصے میں ڈاکٹر صاحب نے اہم ادبی تحریکوں، بحثوں اور ادبی سرگرمیوں کے حوالے سے ادبی منظر نامے کا خاکہ بیان کیا ہے۔ جس سے آنے والے زمانے کے طالب علم مستفید ہو سکیں گے۔

"اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ" کے کئی ایڈیشن چھپ چکے ہیں ہر ایڈیشن میں کچھ تبدیلیاں کی جاتی رہی ہیں اس لئے کہ ہر سال ادب میں کچھ نئے نام چمکتے ہیں اور کچھ نام اپنی چمک کھو بیٹھتے ہیں یا پھر کوئی نہ کوئی رویہ ادبی منظر کو متاثر کرتا ہے اس کے ساتھ ہی کوئی تہذیبی یا قومی واقعہ ادب کو متاثر کرتا ہے۔ جس کے نتیجے میں ادب کا مرکز بدل جاتا ہے اس لئے یہ ضروری ہے کہ جدید ادب پر نظر ثانی کی جاتی رہے۔

مجموعی طور پر میں اس کتاب کی ضرورت کا معترف ہوں ادب کے مجموعی رجحانات کو اس کتاب میں دیکھا جا سکتا ہے یہ سلسلہ جاری ہے۔ جو ادب کو مستقبل میں بھی پرکھتی رہے گی۔

●

ناشر : نسیم درانی
طابع : انجمن پریس، کراچی۔
مقامِ اشاعت : بلاک ڈی، شیر شاہ کالونی، کراچی ۲۸
(مارچ ۱۹۸۴ء - پہلا شمارہ)

انوار احمد

افسانے کی تنقید کے چھ سوال اور سلیم اختر

محض اپنے مضمون کے جواز کی خاطر ہی میں یہ نہیں کہہ رہا کہ ہمارے ہاں افسانے کی تنقید نہ ہونے کے برابر ہے، بلکہ یہ امر واقعہ ہے۔ ممکن ہے کہ اس کی بڑی وجہ تو یہی ہو کہ انگریزی میں بھی افسانے کے فن پر نسبتاً کم لکھا گیا ہے، یا پھر اس مضمون پر کتابیں ہمارے ہاں کم بکتی ہیں دوسری وجہ وہی ہو سکتی ہے، جو رام لعل بیان کرتے رہتے ہیں کہ ہمارے مردانہ سماج میں شاعری کو بیٹا اور افسانے کو بیٹی سمجھا جاتا ہے۔ اس لئے افسانے کے نقاد کے ساتھ لوگ وہی سلوک کرتے ہیں، جو بیٹی کی پیدائش پر مبارک باد دینے والوں کے ساتھ ہوتا ہے، ـــ پھر بھی اب تک اس میدان میں جو کچھ کام ہوا، اپنی اور آپ کی سہولت کے لئے میں اس کے عمومی محرکات کے کچھ زمرے بنا دیتا ہوں۔

★ نصابی اور تجارتی ضرورتیں ★ مدیرانِ جرائد کے جبلّی اور معاشرتی تقاضے ★ چند مضامین اور کتب کے مطالعہ کے بعد وسیع المطالعہ ہونے کے اعلان کی خواہش ★ اپنا اور اپنے پیاروں کے افسانوں کا رتبہ بلند کرنے کا جذبہ ★ قتلِ عام کی آرزو۔

اس تمہید کے بعد اگر میں کہوں کہ ڈاکٹر سلیم اختر نے افسانے کی جو تنقید کی ہے، وہ ان تمام محرکات سے یکسر بے تعلق ہے، تو اس سے حقِ شاگردی تو ادا ہو جائے گا، مگر یہ بیان ہمارے ذرائع ابلاغ کی پالیسی سے بھی ہم آہنگ ہو جائے گا۔

ڈاکٹر سلیم اختر ہر صنفِ ادب کی تنقید لکھتے ہیں، مگر اُن کی افسانہ کی تنقید اس اعتبار سے اہم ہو جاتی ہے کہ وہ افسانہ بھی لکھتے ہیں۔ یوں وہ پریم چند، حسن عسکری، ممتاز شیریں، انتظار حسین، ڈاکٹر احسن فاروقی کے قبیلے میں شامل ہو جاتے ہیں ـــ ان تمام ناقدین کی ناقدری کئے بغیر بھی میرے خیال میں ڈاکٹر سلیم اختر کی قدر و قیمت متعین ہو سکتی ہے، اگر ان سوالوں کا خاطر خواہ جواب مل جائے۔

۱۔ کیا ڈاکٹر سلیم اختر کی کتاب 'افسانہ ـ حقیقت سے علامت تک' کو افسانوی تنقید کی باضابطہ، مربوط اور مستقل تصنیف کا درجہ دیا جا سکتا ہے؟

۲۔ کیا سلیم اختر زندگی، ادب اور افراد کے بارے میں کوئی ایسا تعصب رکھتے ہیں، جو تنقید میں تعلیقیت پیدا کرتا ہے اور جرأتِ اظہار عطا کرتے ہیں؟

۳۔ کیا اُن کے پیشِ نظر بدلتے ہوئے ادبی رجحانات اور ان کے نفسی و سماجی محرکات ہیں یا صرف جرائد کے بدلتے ہوئے مدیر اور مدیروں کے بدلتے ہوئے مزاج؟

۴۔ کیا سلیم اختر کا تنقیدی ذخیرۂ الفاظ برنجان مرنج نامی لغت سے ماخوذ ہے، یا اُن کتابوں سے جن کی اصطلاحوں کے ترجمے میں کافی دقت ہوتی ہے؟

۵۔ کیا سلیم اختر سچ مچ آرزومند ہیں کہ اُن کی تنقید ایسا آئینہ بن جائے، جس میں ہر خوبصورت یا بدصورت افسانہ نگار اپنا چہرہ دیکھ سکے؟

۶۔ اور کیا اُن کی تنقید اردو افسانے کو متاثر کرنے کی اہلیت رکھتی ہے؟

ویسے تو سوالات کا یہ سلسلہ طویل بھی ہو سکتا ہے، مگر یہ سوچ کر کہ ان کا جواب بھی مجھے ہی دینا ہے، اس لئے اِنہی پر اکتفا کرتا ہوں:

۱۔ ڈاکٹر سلیم اختر کی کتاب 'افسانہ، حقیقت سے علامت تک' اردو افسانے پر تنقید کی باقاعدہ اور مربوط تصنیف نہیں، بلکہ بارہ تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ جس کا پہلا مضمون 'باغ و بہار ــ تحقیق و تنقید' ہے۔ جو اُن کی اسی نام سے مرتبہ ایک کتاب میں بھی شامل ہے۔ میر امن کا انصافی احترام کرنے کے باوجود میرے خیال میں یہ مضمون کتاب کے عنوان کے نتیجے میں پیدا ہونے والی توقعات کو نقصان پہنچاتا ہے ــ چار مضامین کا تعلق اردو کے اہم افسانہ نگاروں ـ یلدرم، ندیم، منٹو اور بیدی سے ہے۔ یلدرم اور بیدی کے ایک ایک افسانے کو موضوع بنایا گیا ہے۔ یلدرم کے 'خارستان و گلستان' کو اردو کا بجا طور سے پہلا جنسی افسانہ کہا گیا ہے اور بیدی کے شاہکار 'متھن' کا تجزیاتی مطالعہ کیا گیا ہے، یہ دونوں مضامین اس کتاب کے ہی نہیں، اردو افسانے کی تنقید کے بھی قابلِ قدر مضامین ہیں ــــ منٹو پر لکھے جانے والے مضمون کا عنوان ہی ۱۹۸۲ء میں اور بھی قریبِ رگِ جاں ہو جاتا ہے 'کیا آج سعادت حسن منٹو کی ضرورت ہے؟' ــــ جب کہ احمد ندیم قاسمی کے افسانوں کا تفصیلی محاکمہ کیا گیا ہے، جس کی وقعت کا تعین چوتھے اور پانچویں سوال کا جواب دیتے وقت متعین کیا جائے گا ــــ ایک مضمون مشہور افسانہ نگار اور معروف جملہ باز انتظار حسین کے مضمون کے جواب کا درجہ رکھتا ہے، عنوان ہے 'مختصر افسانہ ــ اعتراضات اور وجوہات' ــــ دو مضامین 'افسانوی تکنیک کا نفسیاتی مطالعہ' اور 'ناول، ناولٹ اور طویل مختصر افسانہ' فنی مباحث لئے ہوئے ہیں۔ باقی رہ جانے والے چار مضامین 'افسانہ، حقیقت سے علامت تک'۔ 'نفسیاتی افسانہ'۔ 'روحِ عصر اور افسانہ' اور 'اردو افسانے میں عورت' اردو افسانے کی تاریخ اور تنقید کے بعض ناموں اور رویّوں کو سامنے لاتے ہیں' ــــ اگر یہ کتاب تنقیدی مضامین کے مجموعے کی بجائے (جو آٹھ دس برس کے عرصے میں ادبی جرائد میں شائع ہوئے) مستقل اور باقاعدہ تصنیف ہوتی تو نہ صرف بعض مقامات پر تکرارِ بیان کی صورت پیدا نہ ہوتی، بلکہ افسانوی تنقید کے نسبتاً اہم سوال بھی زیرِ بحث آتے'۔

۲۔ ڈاکٹر سلیم اختر کو عموماً نفسیاتی نقاد کہا جاتا ہے، ہمارے ہاں نفسیاتی نقادوں کی چار سے زیادہ قسمیں ہیں۔ ایک تو وہ جو فرائڈ، ایڈلر، ژونگ، رانک، ایرک فرام، کولرج، رچرڈز یا کاٹنل ٹرلنگ وغیرہ کے جزوی یا کلی مطالعے کے بعد نفسیاتی نقاد بنتے ہیں۔ دوسرے وہ جن کے ہاتھ خود کفالتی کے لعاب سے لتھڑے ہوتے ہیں اور خانگی وجوہ یا آپ کی قسمت کا متواتر بُرا ہفتہ انھیں نفسیاتی نقاد بنا دیتا ہے، تیسرے وہ جو عام وجوہات کی بنا پر خود کو خاص سمجھتے ہیں، اپنی بدصورت بیویوں اور بدآہنگ مکانوں کو عوام کے مفروضہ غیظ و غضب سے بچانے کی خاطر زمانے کی تخلیقی قوت اور سیاسی و سماجی محرکات کی توانائی سے انکار کر کے ذات کے غار میں قاسم کی طرح 'کھل جا سم سم' کہہ کر داخل تو ہو جاتے ہیں، مگر

باہر نہیں آسکے"، چوتھے وہ جو خوفِ فسادِ خلق کے سبب تخلیقات کی قدر و قیمت متعین کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتے اور یوں تخلیق کاروں کو اِبنارمل یا پاگل بنانے اور اُن کا تجزیۂ نفس کرنے کو ہی تنقید سمجھ بیٹھے ہیں (یہاں تجزیۂ نفس اُن دردناک معنوں میں استعمال نہیں ہوا جو منٹو نے اِسی نام کے افسانے میں مراد لئے ہیں) ـــــ ڈاکٹر سلیم اختر پہلی قسم کے نقاد تھے، اُن کی ڈاکٹریٹ کے موضوع سے باخبر افراد انھیں یہ طعنہ نہیں دے سکتے کہ نفسیات دانوں اور نفسیاتی ناقدوں کے جزوی مطالعے نے انھیں نفسیاتی نقاد بنایا تھا۔ اس میدان میں وہ اردو کے بہت سے ناقدین کی طرح اپنے آپ کو دہراتے نہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ اپنے فکری ماخذات کا کثرت سے حوالہ دیتے ہیں۔ گذشتہ جملے کو چھوڑ کر باقی تین جملوں میں میں نے عمداً 'ہے' اور 'نہیں' کی بجائے 'تھا' اور 'تھے' کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ اللہ اُن کا سایہ ہمارے سروں پر سلامت رکھے! اِن الفاظ کے استعمال کا جواز، اُن کے حالیہ برسوں میں لکھے جانے والے افسانے، احتساب (جلد ۸، شمارہ ۲، ۳، ۴) میں شامل گراں قدر مضمون 'ادبی صورتِ حال' اُن کے تازہ ترین سالانہ ادبی جائزے اور اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ کے ایڈیشنوں کے ساتھ بدلتا لب و لہجہ فراہم کرتا ہے۔ میں ڈاکٹر سلیم اختر کو اُس وقت سے جانتا ہوں، جب وہ نواں شہر ملتان کی پریم گلی میں رہتے تھے، جو پریم دیوتا کی طرح اندھی تھی۔ اِس لئے مجھے اُن کے بارے میں یہ قیاس کرنے کا حق ہے کہ اُن کی حالیہ تحریریں جس طرح ردِ عمل کی گواہی دے رہی ہیں، وہ آئندہ چند برسوں میں ایسا سلیم اختر پورے طور پر ہماری سامنے لائیں گی، جو ادب و شعر کو اندھے کنویں کی صدا قرار دینے کی بجائے جہدِ انسانی کا بامعنی عمل سمجھتا ہو، ـــــ ڈاکٹر سلیم اختر کے ہاں جرأتِ اظہار پیدا ہو چکی ہے اور ادب و حیات کے بارے میں تعصبات بھی، جو کسی بڑے نقاد کا سرمایہ ہیں، بس انھیں اس صورتِ حال کے ذاتی محرکات کے آسیب سے نکلنا ہے۔

۳۔ اس سوال کو دیکھتا ہوں تو سوچتا ہوں دوسرے سوال کے جواب میں جہاں میں اپنے تعصب پر سے پردہ اُٹھا چکا، وہاں اس پہلو کی جانب بھی اشارہ کر چکا ہوں کہ بلاشبہ اُن کے پیشِ نظر بدلتے ہوئے ادبی رجحانات اور اُن کے نفسی و سماجی محرکات ہیں۔ کیونکہ اُن کا ذاتی مخالف بھی اس امر سے انکار نہیں کر سکتا کہ سلیم اختر نے مطالعے اور مشاہدے کے باغ کی جانب کھلنے والی کھڑکی کھول رکھی ہے ـــــ البتہ ایک عملی انسان کی طرح وہ جرائد کے بدلتے ہوئے مدیر یا مدیروں کے بدلتے ہوئے مزاج پر بھی نظر رکھتے ہیں۔

۴۔ یہ مرنجان مرنج، ذخیرۂ الفاظ، بے معنی یا لاتعلق الفاظ پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس معاشرے میں ایسے ذخیرہ اندوز کی بڑی قدر ہوتی ہے، جہاں صفات گھٹ جائیں اور اسمائے صفات بڑھ جائیں۔ زبان کی امر بیل گھر آنگن کے پیڑوں کو چاٹ جائے اور احساس زبان کا پرندہ روحوں سے ہجرت کر جائے ـــــ ڈاکٹر سلیم اختر ایک عرصے سے اس ذخیرۂ الفاظ کو زیادہ مستحق افراد کے حوالے کر چکے ہیں، اُن کے یہاں نئی ووکیبلری بن رہی ہے اور مجھے یقین ہے کہ رفتہ رفتہ اُن کا سیاسی و سماجی اور فنی شعور انھیں جس مقام پر لے آئے گا کہ وہ اپنے کسی دوست کی "محبت"، ادبی انعامات دینے والوں کی "اُلفت" یا سرکاری "التفات" کے اندیشے کے بغیر کلمۂ حق کہتے چلے جائیں گے اور بُت کدۂ تنقید میں ایک نہ ایک دن 'غلغلۂ الاماں' برپا ہو گا۔

۵۔ تاہم اب بھی وہ اس درجے کے نقاد ہیں، جو عمومیت کو خصوصیت پر قربان کرنے کی اہلیت رکھتا ہو۔ ان کے بہت سے مضامین ایسے ہیں جن میں کسی افسانہ نگار کے بارے میں دی ہوئی رائے کو دوسرے افسانہ نگاروں پر بھی منطبق نہیں کیا جاسکتا۔ یہ اور بات ہے کہ فی الحال وہ وضع داری کی خاطر 'ہجوِ ملیح' یا دوہرے لب و لہجے پر اکتفا کرتے ہیں۔ احمد ندیم قاسمی کے افسانوں کے بارے میں اُن کے مضمون کا جائزہ اِس نقطۂ نظر سے لیا جائے تو میرے موقف کی تائید ہو گی، احمد ندیم قاسمی کی انسان دوستی اور شفقت کا احترام

نیں بھی کرتا ہوں، مجبور خواتین سے اُن کے حسنِ سلوک کا قائل میں بھی ہوں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اُن کے بعض افسانوں کی بھی میرے دل میں بڑی جگہ ہے۔ مگر جب سے اُن کے تازہ ترین افسانوی مجموعے "نیلا پتھر" کے مطالعے کا جُرم سرزد ہوا ہے، اعجاز سلیم اختر کے اِن جملوں کی داد دینا پڑتی ہے:

> "اس افسانے (فقیر سائیں کی کرامات) میں بس یہی کچھ ہے اور یہ خشک کاری کی شعوری کاوش سے اس حد تک مجروح ہے کہ آج اگر مصنف کا نام بدل کر "فنون" کو بغرضِ اشاعت بھیجا جائے تو مدیرِ محترم اسے شائع نہ کریں۔" ('افسانہ، حقیقت سے علامت تک' ص ۲۰۲)
>
> "ندیم صاحب، منٹو کی مانند چیر پھاڑ سے دلچسپی نہیں رکھتے۔ بلکہ کرداروں کو کانچ کے برتن سمجھتے ہوئے نہایت احتیاط سے انھیں چھوتے ہیں۔" (ص ۲۰۹)
>
> "یہ افسانہ ("موجِ خوں") بھرپور تاثر کا حامل ہے۔ البتہ اگر تحلیل نفسی کی روشنی میں اس پیچیدہ نفسیاتی اُلجھن کی تشکیل کرنے والے لاشعوری عوامل کی نشاندہی بھی کر دی جاتی، تو اس سے افسانے میں نئی گہرائی پیدا ہو جاتی۔" (ص ۲۱۶)

'اردو افسانے میں عورت' سلیم اختر کے اہم ترین مضامین میں سے ہے۔ اس مضمون میں بھی اختلاف کے کئی گوشے ہیں۔ مثلاً جب وہ پریم چند کے افسانوں کے نمائندہ نسوانی کرداروں میں سے ملیا (وفا کی دیوی) اور مس پدما ('مس پدما') کو منتخب کرتے ہیں تو یہ محض اتفاق نہیں کہ اُن کی نگاہ انتخاب ایم۔اے اردو کے نصاب میں شامل 'زادِ راہ' کے دو افسانوں پر ہی پڑتی ہے، حالانکہ آشا ('نئی بیوی')، رام پیاری ('مالکن') اور بوڑھی کاکی ('بوڑھی کاکی') شاید پریم چند کے بہتر نسوانی نمائندے ہیں۔ اسی طرح ان کی طویل فہرست میں سے قدرت اللہ شہاب کی ماں جی ('ماں جی') اور ممتاز شیریں کی 'نانی اماں' (آئینہ) کا غائب ہونا تعجب اور تاسف کے جذبات پیدا کرتا ہے۔ مگر اپنے موضوع کی حدود کے اعتبار سے اس مقالے میں بہت سے معنی خیز نکات اردو میں پہلی مرتبہ اُٹھائے گئے ہیں (۱) کس طرح کی عورت کو نمائندہ عورت کہا جا سکتا ہے؟ (۲) نسوانی محسوسات اور اس کے فریب میں کیا فرق ہے (۳) اب تک اردو افسانے میں پیش کئے جانے والے نسوانی کرداروں میں سے کون سے ایسے کردار ہیں جن کے ساتھ آنکھ اوجھل، پہاڑ اوجھل کا ماجرا نہیں)——— اسی طرح بلدرم کے 'خارستان و گلستان' کا تجزیہ چونکا دینے والے نتائج کا حامل ہے (نسرین نوشیں اور اس کی کنیزوں کی جسمانی قربت کا مفہوم) مگر سب سے زیادہ فنی پختگی کا احساس 'مریضِ کہ تجزیاتی مطالعہ' میں ہوتا ہے۔ ایک حساس موضوع پر اردو کے ایک انتہائی تہہ دار افسانے کا تجزیہ بغیر کسی ذہنی تحفظ یا عمومی اصطلاحوں کے استعمال کے' جس طرح انھوں نے کیا ہے، وہ ادب کے طالب علموں کے دلوں میں سلیم اختر کے لئے محبت کے جذبات پیدا کرتا ہے۔

۶۔ جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ کیا اُن کی تنقید اردو افسانے کو متاثر کرنے کی اہلیت رکھتی ہے؟ میرا جی چاہتا ہے کہ اِس سوال کو خارج از نصاب کہہ کر واک آؤٹ کر جاؤں۔ مگر خود کلامی کی صورت میں یہ تو بتا تا چلوں کہ کس طرح کی تنقید اردو افسانے کو متاثر کرنے کی اہلیت رکھتی ہے ——— ایسی تنقید جو اس صنفِ ادب کو روزِ اوّل سے ہی پہنچنے والے جذباتی اور ذہنی دھچکوں کے لئے "SHOCK ABSORBER" کا کام دے سکے، جو کہانی کے گُم شدہ سامع کو برضا و رغبت کہانی کے الاؤ پر واپس لا سکے، مگر اس سے پہلے اس الاؤ پر تابعض بہروپئے کے نقلی داڑھی مونچھ جھلسانے ہوں گے۔

غلام حسین اظہر

سلیم اختر کے افسانے

سلیم اختر کی افسانہ نگاری کا فکری اور فنی دائرہ خاصا بسیط ہے۔ اس کی فکر اور فن کے ڈانڈے اگر ایک طرف انگارے سے ملتے ہیں تو دوسری طرف نئے افسانے یعنی تجریدی اور علامتی افسانے تک محیط ہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ اس نے ہنگامی تحریکوں کا اثر قبول کیا ہے۔ بلکہ اس کے کینوس کی وسعت کا سبب اس کا مطالعہ اور مشاہدے کی وسعت اور عمق ہے۔ سلیم اختر نے افسانہ نگاری کے علاوہ اپنی زندگی کا بیشتر حصہ نفسیات کے مطالعہ میں صرف کیا ہے۔ اس وجہ سے نفسیاتی ژرف بینی کا جوہر اس کی شخصیت اور فن کا جزو لاینفک بن گیا ہے۔ اور وہ کرداروں کا بڑی گہری نظر سے جائزہ لیتا ہے۔ اس کے یہاں انگارے کے افسانہ نگاروں کی بیباکی منٹو اور عصمت کا تیکھا پن اور بصیرت کا ایک حسین امتزاج نظر آتا ہے اس بیباکی اور نفسیاتی عمق کو جب وہ آج کے انسان کے مطالعے اور مشاہدے میں بروئے کار لاتا ہے تو وہ نئے افسانہ نگاروں کا ہم رکاب نظر آتا ہے لیکن روایت کا اثر اسے بے معنویت کے اثرات سے محفوظ رکھتا ہے۔ اس کی علامت نگاری اور تجریدیت ایک شوق فضول نظر نہیں آتی بلکہ نئے فکری رجحانات اور نئے اقتصادی رشتوں سے پیدا ہونے والے انقلاب سے آگہی بخشتی ہے۔

اس کے افسانوں کا سب سے بڑا امتیازی وصف اس کا ابنارمل کرداروں سے شغف اور ان کا نفسیاتی تجزیہ ہے، اس نے جنسی گھٹن، اعصابی تناؤ، نرگسیت، ہم صنفی عشق، امرد پرستی، جنسی انتقام، ذہنی خلفشار اور جذباتی انتشار کی کیفیات و محسوسات کو گرفت میں لینے کی اکثر افسانوں میں بڑی کامیاب اور فکر انگیز کوشش کی ہے، مثلاً "خبیث دا پتر" میں امرد پرستی اور جنسی انتقام کا تجزیہ ہے۔ تو "زن مرید" میں احساس جرم اور تلافی کے ملے جلے نفسیاتی عمل کا گہرا مشاہدہ اور مطالعہ شامل ہے، "آئینہ اور دل کے ٹکڑے" میں احساس نرگسیت کی شکست کے بعد پیدا ہونے والے تلخ اور اذیت ناک جذبات کا اظہار کیا گیا ہے، "دوراستے ایک پل" میں اس نے منٹو کی طرح طوائف کے یہاں نسائیت کی تلاش کی ہے۔ "غسل سے پہلے" جنسی الجھنوں اور جنسی محرومی کے مضحکہ خیز نتائج کا آئینہ دار ہے، "پاؤں کی جنت" ایک ذہنی اور جذباتی تعقید (COMPLEX) کا مظہر ہے۔ "مثلث کا نیا زاویہ" جنسی زندگی کے نفسیاتی مطالعہ کا ترجمان ہے۔ "درد کا بندھن" میں گھریلو زندگی کی مناقشوں اور جھگڑوں پر ایک نقطۂ نظر سے نگاہ ڈالی گئی ہے۔ "بکری" میں جذبات اور ذہنی مطابقت (SELF INDENTIFICATION) کو اجاگر کیا گیا ہے۔ انسانی شخصیت کے ابنارمل اور حریصانہ پہلوؤں کی عکاسی اور ترجمانی کے علاوہ سلیم اختر نے اپنے افسانوں میں آج کی نفس پرست اور کھوکھلی تہذیب اور بے روح اور بے جہت معاشرے میں فرد کی تنہائی اور کرب کے المیہ کو بھی نمایاں کیا ہے، سیم و زر سے مسموم سماج میں عائلی اور سماجی زندگی جس سانچے میں ڈھلتی ہے۔ اس کی ترجمانی "نولیتا ۱۹۶۹ء" "تخلیق ۱۹۷۰ء" "سیفو ۱۹۶۸ء" "باپ بیٹیاں" اور محاذ ۱۹۷۱ء جیسے افسانے کرتے ہیں۔ ان مؤخرالذکر جن میں سرمایہ دارانہ نظام کے مہیب سایوں کو گھریلو فضا اور انسانی رشتوں پر منحوس سایہ ڈالتے دکھایا گیا ہے۔

افسانوں میں سلیم اختر حقیقت نگاری کو ایک نئے اسلوب میں ڈھالتا نظر آتا ہے اور ان افسانہ نگاروں سے وہ مختلف ہے، جو بے معنویت اور بے جہتی کو فروغ بخشنے میں معروف ہیں اور جن کے یہاں اقدار کے آشوب کا ذکر فکری آشوب پیدا کرنے کا بالواسطہ ذریعہ ہے۔

فکری بلندی اور نفسیاتی ژرف بینی کے علاوہ سلیم اختر کے افسانے کا یہ وصف بھی قابلِ ذکر ہے کہ فکری بلندی اور نفسیاتی بصیرت اس کے یہاں خشک اور بے روح اسلوب میں ظہور پذیر نہیں ہوتی، بلکہ ان خوبیوں کے ساتھ ساتھ فنی چابکدستی بھی خاصی موثر ہے۔ جذبات اور احساسات کے مدوجزر کے بیان پر سلیم اختر کو مکمل قدرت اظہار حاصل ہے، مثلاً آئینہ اور دل کے ٹکڑے کا یہ ابتدائیہ ملاحظہ فرمایئے۔

...... اس نے آئینہ فرش پر دے مارا

اس کے لبوں سے ایک ایسی آواز نکلی جس میں بیک وقت دہشت، نفرت اور کراہت پوشیدہ تھی "یہ - یہ - یہ میں ہوں" اس نے شکستہ آئینے کے ٹکڑوں میں جیسے دوبارہ جھانک کر تعجب سے خود سے سوال کیا - "میں" ؟ پھر وہ اوندھی لیٹی تکیے میں منہ دبائے رو رہی تھی، وہ کافی دیر تک روتی رہی - اور جب روتے روتے نڈھال سی ہوگئی اور سسکیاں لیتے لیتے گلے میں درد ہونے لگا، تو وہ بے دم سی آنکھیں موندھے پڑی رہی، اور اسی حالت میں سوگئی - اس نے بڑا سندر سپنا دیکھا - وہ خود کو ہلکی پھلکی سی محسوس کر رہی تھی. ایسے جیسے کوئی سبک خیال ہو - اور ایک گیت کی دھن کی مانند وہ ہوا کے دوش پر رقصاں رقصاں جارہی تھی - پھر اس نے سامنے ایک مرمریں قصر دیکھا وہ عالمِ تحیر میں کسی پرند کی طرح اس کی طرف محوِ پرواز رہی، جب قریب پہنچی تو اسے معلوم ہوا کہ یہ دودھیا بادلوں سے بنا ہوا تھا، جیسے ہی وہ اس کے قریب آئی، اس کے دریچے وا ہوگئے - اس نے دریچہ میں سے اندر جھانک کر دیکھا اور کسی پردہ کی طرح وہیں لہرا کر رہ گئی، سامنے خوبصورت کمرے میں ایک لڑکی تھی، بے حد خوب صورت، خیال سے بھی زیادہ حسین اور خواب سے زیادہ دل کش، ہاں وہ واقعی حسین تھی. چمپئی رنگ لمبے بال، بھرے بھرے لب، سب کچھ اسی جیسا تھا بلکہ اس کے بالائی لب پر ننھا سا تل بھی تھا - وہ حیران سی کھڑی اسے دیکھ رہی تھی سر مو فرق بھی تو نہ تھا - بالکل ایسے جیسے وہ خود اپنے عکس کو مختلف لباس میں دیکھ رہی تھی - پاؤں کی سندر ایڑیوں سے لے کر مدھ ماتی آنکھوں کی چمک تک، وہ اسی کا تو عکس تھی - اس کے بال تیز ہوا کے جھونکوں سے لہرا رہے تھے - اس کا سفید لبادہ بھی اڑ رہا تھا اور کھلے بازوؤں میں اس کی کلائیاں موسی شمعوں کی طرح دمک رہی تھیں - اتنے میں ایک خوب صورت نوجوان آیا - بالکل شہزادہ سا، لڑکی کو شاید اسی کا انتظار تھا - وہ دونوں بغلگیر ہوگئے - اور وہ .... اور .... وہ ...."

یہ تو سپنوں کا عالم ہے، طلسم خیال ان سپنوں میں رنگ بھرتا نظر آتا ہے - لیکن عالمِ حقیقت میں قدم رکھنے کے بعد جب یہ سپنے ٹوٹتے ہیں تو پھر یہ کیفیت ہو جاتی ہے - "اپنی تنہائیوں کو ایک خزانہ سمجھتے ہوئے وہ ان پر کسی ناگن کی طرح پھنکاریں مارتی رہتی۔"

اور آخر یہ حالت ہوتی ہے کہ وہ اپنے نوکر فضلو سے، جو بد صورت بھی ہے، اور سماجی طور پر اس سے کم تر بھی ہے، اس سے اپنا مقابلہ کرتی ہے، اور نرگسیت کی شکست ایک تیر بن کر اس کے دل کے پار ہو جاتی ہے، بد صورتی اور نرگسیت کی شکست یہ المیہ موپاساں کے افسانے (NECKLACE) کی ہیروئن کے المیہ کی یاد بھی دلاتا ہے - نفسیاتی ژرف بینی اور فنی چابکدستی نے اس افسانہ کو آنا دقیع بنایا ہے کہ باید و شاید، "مثلث کا نیا زاویہ" میں بھی سلیم اختر نے اعصابی تناؤ اور جنسی ہیجان کی کیفیت کو بڑے موثر انداز میں اجاگر کیا ہے - مثلاً

"کچھ دیر بعد صحن کی تیز دھوپ نے پسینہ سے اس کے جسم کو بھگو دیا تو اس نے کپکپی میں تو کچھ کمی محسوس کی مگر اعصابی تناؤ جسم کو یوں بوجھل بنا دیا تھا - گویا وہ گوشت کا نہیں بلکہ سیسہ کا بنا ہوا ہے اور بڑی دیر تک وہ یونہی چار پائی پر لاوارث

بستر کی طرح پڑی رہی"

سلیم اختر کے فن کے اسی پہلو کی طرف توجہ دلانے کے لئے وزیر آغا نے لکھا ہے

"سلیم اختر نے فرد کی جنسی زندگی میں ضبط اور اظہار کی دو سرحدوں کے درمیان دور تک پھیلے ہوئے NO MAN'S LAND کے متعدد جذباتی نشیب و فراز کا مطالعہ کیا ہے، وہ نام نہاد تہذیبی لبادے کو منافقت اور ریاکاری کا پرچم قرار دیتے ہیں۔ اور جب اسے نوچ کر ہم سے الگ کرتے ہیں تو کردار کے اصل روپ سے تعارف حاصل ہو جاتا ہے۔

یہی وہ میدان ہے، جہاں سلیم اختر "انگائے" کی روایت اور منٹو کے دبستان میں فکری اور فنی اضافہ کرتا نظر آتا ہے، وہ صرف الفاظ سے پیدا کردہ تلذذ سے قاری کو اپنی گرفت میں نہیں لیتا بلکہ کردار کی داخلی کشمکش کو بے نقاب کرتا ہے جو، افسانہ نگار سے نفسیاتی آگہی اور فنی چابک دستی کا تقاضا کرتی ہے۔ سلیم اختر نے اس تقاضے کو خوب نبھایا ہے، یہی کامیابی اس کے افسانوں کی جان ہے۔"

سلیم اختر کی فکری عظمت اسے صرف نفسیاتی الجھنوں اور داخلی تصادم کی کہانی بیان کرنے تک محدود نہیں رکھتی، بلکہ اسے اجتماعی تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے پر بھی ابھارتی ہے۔ چنانچہ وہ انفرادی زندگی کے ساتھ ساتھ اجتماعی زندگی کے گوشوں کو بھی نمایاں کرتا ہے۔ مثلاً "نسل سے پہلے" محض جنسی بے راہ روی اور جنسی ہیجان کی کہانی ہی نہیں، بلکہ اس میں نام نہاد اونچی سوسائٹی کے کھوکھلے پن کو بھی دکھایا گیا ہے۔ جہاں معیارِ زندگی کا خیال عصمت اور عفت کی قدروں کو پامال کر رہا ہے، مسز راجہ کا کردار اس زلیخا کا کردار جو ہر دور میں بالائی طبقے میں موجود رہی ہے، یہی اخلاقی انحطاط "باپ بیٹیاں" میں ایک اور روپ میں سامنے آتا ہے، لیکن اس کے اظہار کے لئے سلیم اختر نے مصلح کا بہروپ نہیں دھارا۔ بلکہ اندازِ فکر کے تحت اس رجحان کے اصل اسباب کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس نے حقیقت پسندانہ طور پر فرد کے بجائے سماج کو اصل مجرم ٹھہرایا ہے، اس آزادہ روی کی طرف بھی اشارے کئے ہیں، جو آزادہ روی اور بے راہ روی کی اتیازی لکیر کو معدوم کر رہی ہے اور جس کے باعث آزادی سامانِ شیون بن رہی ہے۔ "لولیتا ۱۹۶۹ء" اور "سیفو ۱۹۶۸ء" میں اس نے فکری اور جذباتی تبدیلیوں اور نئی اور پرانی نسل کے رویوں کے فرق کو بڑے ہلکے پھلکے انداز میں واضح کیا ہے۔ اور قاری کی ذہانت پر مکمل اعتماد کیا ہے، کئی افسانوں میں تو اس نے پورے سماج کی شکست و ریخت کو سامنے لانے کی سعی مشکور کی ہے، مثلاً جنگ کے موضوع پر اپنے مشہور افسانہ "محاذ ۱۹۷۱ء" میں دورانِ جنگ اپنی خارجی اور داخلی زندگی کے تمام بگڑتے ہوئے خدوخال نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ اور ہمیں چونکا دیتے ہیں کہ ہماری زندگی کس جانب جا رہی ہے، مثلاً

"میرے دوست نے سہارا دے کر مجھے اٹھایا، میں بمشکل کانپتی ٹانگوں پر کھڑا تھا، ٹانگیں سو گئی تھیں۔ اور جب اس نے ایک دم ہاتھ چھوڑا۔ تو میں لڑکھڑا گیا۔

اور پھر میری بیوی جیسے چیخی "یہ کیا؟"

میں اپنے ہی بنائے ہوئے تالاب میں کھڑا تھا"

"خاموشی کے کیپسول" میں بھی ہمیں آج کا حاتم جن منزلوں اور ہفت خواں سے گزرتا نظر آتا ہے، وہ منزلیں پہلے سے زیادہ کڑی اور کٹھن ہیں۔ اور سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ نیا حاتم اس اسم اعظم کو بھول چکا ہے، جس سے پہلے مشکلیں آسان ہو جایا کرتی تھیں، آج وہ دوہرے عذاب میں گرفتار ہے۔ "آئینہ تکرارِ تمنا" بھی دورِ حاضر کے انسان کی طرح لاحاصلی کا ترجمان ہے۔ اس میں دکھایا گیا ہے کہ آج انسان ستاروں کی تلاش کر رہا ہے، لیکن ستاروں کی یہ تلاش اسے ستاروں تک لے جانے کی بجائے اسے آتش فشاں تک لے جا رہی ہے اور اس کی

سراپا جہنم بنتی جا رہی ہے، اور وہ درماندگی کے باعث مختلف پناہ گاہیں تلاش کر رہا ہے، لیکن یہ پناہ گاہیں بھی اسے سہارا نہیں دیتیں، بلکہ اس کے کرب واندوہ میں اضافہ کرتی جا رہی ہیں۔ "بے چہرہ لوگ" میں صنعتی تہذیب سے پیدا ہونے والی یکسانیت اور بے رنگی کی طرف توجہ دلائی گئی ہے، جس کی وجہ سے انسان مشین بنتا جا رہا ہے۔ یہاں پہنچ کر سلیم اختر کے فکر و فن کی دنیا، منٹو اور عصمت کی دنیا سے مختلف ہو جاتی ہے۔ ادھر وہ لارنس، سارتر اور کامیو کا ہمنوا و ہم عنان بن جاتا ہے، جو جنسی گھٹن سے ہی انسان کو نجات نہیں دلانا چاہتا، بلکہ اس تہذیب و تمدن اور سماجی ڈھانچے کے بھی مخالف ہیں۔ جو انسانی تشخص اور انفرادیت کا گلا گھونٹ دے۔ یہاں پہنچ کر اس آزادی کا تصور رشید جہاں، منٹو، عصمت وغیرہ سے زیادہ وسیع ہو جاتا ہے، وہ انسان کے جبلی تقاضوں اور داعیات کی تسکین اور آسودگی کے علاوہ انسان کی شخصی آزادی اور مشینی اور سماجی جبر اور سنگلاخی سے نجات دلانے کا بھی آرزو مند نظر آتا ہے، نئے افسانے اور نئی سوچ کا محور یہی آزادی کا تصور ہے۔ جسم اور روح کے بیک وقت تقاضوں کا احساس اور انسان کے جسم اور روح کی آزادی کی امنگ سلیم اختر کے نئے افسانوں کا موضوع ہے، اس کا یہ فکری اور فنی ارتقا اس سے خوش آیند توقعات وابستہ کرنے پر ابھرتا ہے۔

بشکریہ۔ سیپ کراچی۔ شمارہ ۳۲ (اگست، ستمبر ۱۹۷۵ء) گوشۂ سلیم اختر

مستنصر حسین تارڑ

سلیم اختر کے گرم سکے

ادب میں نقاد کا رول امریکی جنس تحقیق نگار ماسٹرز اینڈ جانسنز کا سا ہوتا ہے جس لمحے وہ کسی لکھنے والے کو محرک دیکھتا ہے اس وقت اپنی تنقیدی سٹاپ واچ آن کر دیتا ہے اور چہرے پر بے اعتنائی کا نقاب اوڑھتے بے مہری کے دستانے چڑھا کے ایک سرد نگاہ سے اس کے تخلیقی مراحل کا مشاہدہ کرنے لگتا ہے عمل کی ابتدا میں وہ جانچتا ہے کہ ادیب صنف کے وجود کو حدت دینے کے لئے اس پر کتنی مشاقی سے قلم کا ہاتھ پھیرتا ہے کیا صنف کا بدن اس کے لمس سے خود سپردگی کی سرخی کی جانب مائل ہو رہا ہے یا لاتعلقی سے بے حس اور سرد پڑا رہتا ہے اگر صنف کے اعضا تھرتھراتے ہوئے خود سپردگی پر آمادہ ہو رہے ہیں تو کیا ایسا تو نہیں کہ ادیب وقت سے پہلے ہم حدتوں کی آمد سے قبل ہی اس میں حلول کر جانا چاہتا ہو اور یوں ایک غیر مکمل اور ناآسودہ محبت نے جنم لے لیا ہو اگر وہ لمحۂ وصال کی پہچان کا ادراک رکھتا ہے تو کیا یہ وصال ایک طویل مدت پر محیط ہو جاتا ہے یا نشہ کی کثرت کی وجہ سے ہم فارغ ہوئے شتابی سے کی نوبت آجاتی ہے چنانچہ نقاد اطمینان سے اپنے سامنے ظہور پذیر ہونے والے تخلیقی عمل کا مشاہدہ کرتا ہے اور پھر حسب توفیق اپنی ریکارڈ بک میں ادیب کی تخلیقی صلاحیتوں کا اندراج کرتا چلا جاتا ہے یوں ادب کی تشکیل کے حوالے سے نقاد ایک "آؤٹ سائیڈر" کی حیثیت رکھتا ہے جو ایک محفوظ فاصلے سے صرف مشاہدہ کرتا ہے جانچتا ہے تولتا ہے ناپتا ہے۔ پھر ایک روز ایسا بھی آتا ہے جب نقاد کے اندر بھی خواہش کا علم بلند ہو جاتا ہے اس کا جی چاہتا ہے کہ وہ بھی دور سے نظارہ کرنے کی بجائے خود تخلیقی عمل میں شامل ہو تماشائی سے تماشا بنے کیونکہ ایک وسیع نظری تجربے کی بنا پر اسے زعم ہوتا ہے کہ وہ اس عمل کو بقیہ تمام تخلیق کاروں سے بہتر طور پر سرانجام دے سکتا ہے چنانچہ وہ تنقید کا ترازو رکھ دیتا ہے اور ایک متکبر اعتماد کے ساتھ آگے بڑھ کر ادب کے بدن پر ہاتھ ڈال دیتا ہے دیکھنے والے دیکھتے ہیں کہ وہ تخلیقی عمل کو تکنیکی اعتبار سے تو سو فیصد درست سرانجام دیتا ہے مگر اس کا میکانکی رویہ صنف کے جسم کو ٹھنڈا کر دیتا ہے وہ خود تو لذت حاصل کرتا ہے مگر ادھر بے جان کیفیت ہی طاری رہتی ہے وہ تخلیق کو نکتہ عروج پر پہنچا کر والہانہ ہم آغوشی پر مجبور نہیں کر سکتا تخلیق کے ناخن اس کی پشت میں نہیں کھبتے، اس کے ہونٹ دانتوں تلے نہیں دبتے اس کے اعضا کی ساخت خواہشوں کے مطابق نہیں ڈھلتی اور یوں نقاد جھنجھلا کر ایک مرتبہ پھر کلینکل ریسرچر بن جاتا ہے اور اب اسے عمل کو عمدگی سے نبھانے والوں کے بخیئے ادھیڑنا شروع کر دیتا ہے ..... سلیم اختر ایک نقاد ہے اور شکل سے ایک مکمل کلینکل ریسرچر دکھائی دیتا ہے چہروں پر بڈھوں کی سی دانائی سجائے گم سم بے چارگی سے بیٹھا آنکھیں جھپکتا ہوا، ہمہ وقت ادب کی بیلنس شیٹ پر اندراج کرتا

ہوا، مشاہدے کے وقت اس کا چہرہ مردہ ہو جاتا ہے کیونکہ اصل چہرہ گہرائی میں چلا جاتا ہے اور اس پر صرف ایک نقاب باقی رہ جاتا ہے جو سلیم اختر دکھائی دیتا ہے مگر ہوتا نہیں اور اس پر ایک عینک لگی ہوتی ہے .... میں اس کے دلچسپ مطالعے اور سوبر تنقیدی رویوں کا شروع دن سے معترف تھا اور مجھے اس کے مضامین میں نہایت برطانوی قسم کا ہلالی کھنچے ہوئے ہونٹ والا مزاح اور جنس کے لطیف نمناک حوالے بے حد پسند تھے جنہیں وہ نفسیات کی چادر میں تشریح کر لیا کرتا ہے کبھی کبھار سے ادبی محفلوں میں تنقیدی مضمون کے بجائے افسانہ پڑھتے ہوئے بھی پایا مگر میں نے اس کے اس عمل کو ہمیشہ شک کی نظروں سے دیکھا کہ شاید سلیم اختر بھی دوسرے نقادوں کی طرح مشاہدہ کرتے کرتے ایکسائٹ ہو گیا ہے اور اب بنفس نفیس صنف افسانہ پر سوار ہونے کی کوشش میں ہے یہ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ میں نے کبھی غور سے اس کا افسانہ سننے کی زحمت گوارا نہ کی اور اس کی اپنی ہینڈ رائٹنگ میں اسے پڑھنا اتنا ہی دشوار ہے جتنا موہنجو ڈارو کی مہریں پڑھنا اور اس بدخطی کی بنا پر کاتبوں نے اسے بالپوائنٹ رقم کے خطاب سے نواز رکھا ہے، اس کے افسانوں سے بے حسی کی یہ کیفیت اس روز اچانک ختم ہو گئی جب میں نے اگرچہ نہایت مربیانہ طور پر "ذوسیارے" کا مطالعہ شروع کیا مگر خاتمے تک میری حالت انتہائی مرعوبانہ قسم کی ہو گئی وہ تو ایک اول درجے کا بے حد خود مختار افسانہ نگار بھی تھا سلیم اختر نے اس افسانے میں لندن کے پس منظر میں انسانی اور سیاسی جذبوں کی شدت کو اتنی مہارت سے نبھایا تھا کہ میرا وہ بال پوائنٹ ہوا میں ہی معلق رہا جو میں نے اس نیت سے ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا کہ وہ چند ایسے سفر نامہ نگاروں کی طرح جوان دیکھے شہروں کی روئیداد لکھتے ہیں اور پکڑے جاتے ہیں کہیں نہ کہیں پکڑا جائے گا انگریزی زبان کا محاورہ اور برطانوی فضا اتنی اوریجنل تھی کہ میری جگہ چارلز ڈکنز بھی ہوتا تو سلیم اختر صاف بچ کر نکل جاتا "ذوسیارے" کے بعد میں سلیم اختر کے بقیہ افسانوں کی تلاش میں نکل گیا انہیں دریافت کیا پڑھا اور تب مجھ پر انکشاف ہوا جب وہ تنقید کی کلینکل ریسرچ کو تیاگ کر تخلیق کے وجود سے رابطہ بڑھاتا ہے تو افسانے کی صنف میں وہ یوں پیوست ہو جاتا ہے کہ اس صنف کے ناخن اس کی پشت میں کھب جاتے ہیں وہ ہونٹ دانتوں تلے دبا لیتی ہے اور اس کے اعضا کی ساخت سلیم اختر کی خواہشوں کے مطابق ڈھلتی چلی جاتی ہے

اردو ادب انسانیت کے نصف حصے کی نفسیات اور عادات کی کہانی ہے یہ ایک جزو ہے جسے ہم لاکھ کوشش کے باوجود بھی کل کی جانب نہیں لے جا سکتے اور قابل فہم طور پر کہ ہم ایک مرد کی حکمرانی والے معاشرے میں رہتے ہیں جہاں عورت ایک کل کی حیثیت سے ہم پر نہیں کھلتی۔ ہم صرف مردوں کے بارے میں لکھتے ہیں اور انسانیت کے بقیہ نصف حصے جو کہ عورت ہے سے قطعی طور پر لاعلم ہیں اور اگر ہم اس نصف حصے کی طرف رجوع کرتے ہیں تو بھی ایک مرد کے مخصوص نکتہ نظر سے جو ظاہر ہے پوری انسانیت کا نکتہ نظر نہیں ہو سکتا ہمارے سامنے ہمیشہ صرف اپنی چند رشتہ دار خواتین کے ماڈل ہوتے ہیں چنانچہ جب ہم ایک بوڑھی عورت کا پورٹریٹ بناتے ہیں تو وہ لامحالہ آپ کی والدہ یا چچی وغیرہ کا تجربہ ہو گا ایک شریف نوجوان لڑکی کے لئے ہمشیرہ سامنے ہوتی ہے اور جب ہم جنس کے بارے میں قلم اٹھاتے ہیں تو صرف بیوی ہی نظر آتی ہے یا ایک آدھ حادثاتی تجربہ مددگار ثابت ہو جاتا ہے ہم ان محدود حادثوں پر اکتفا کرتے ہوئے ایک محدود ادب تخلیق کرتے ہیں ہمیں یہ قطعی نہیں معلوم کہ ان رشتوں کے علاوہ جو عورت ہے وہ مخصوص حالات میں کس طور ری ایکٹ کرتی ہے ایک بس میں، بازار میں، دکان میں، کھیت میں، محفل میں مرد کے رعب داب کو منفی کر کے اس کا کرداری عمل کیا ہو گا، سلیم اختر کے افسانے اس لحاظ سے بھی اہم ہیں کہ ان میں عورت ایک پرو ٹو ٹائپ کی حیثیت سے ایک مرد ادیب کی خواہش کے مطابق سامنے نہیں آتی بلکہ مردانہ حکمرانی کے آزار سے آزاد ایک خود مختار فرد کی حیثیت سے ابھرتی ہے اور یوں سلیم اختر ایک ایسی وادی میں اترا ہے جہاں اس سے پہلے کم ہی لوگ آتے ہوں گے

ہمارے ادب میں جنس پر ہاتھ اٹھانے والے ادیبوں نے بیشتر اوقات ایسے کرداروں کا سہارا لیا جو معاشرے میں ایک پنچ مقام کے حامل تھے اور اس نظریہ پر تکیہ کر لیا گیا کہ صرف ایسے افراد ہی اپنے اندر جنس کا ابال محسوس کرتے ہیں ان میں طوائفیں اداکارائیں، دلال، اینگلو انڈین لڑکیاں اور مقامی داداگر قسم کے کردار سر فہرست تھے یہ ایک محدود کینوس تھا اور محفوظ بھی کیونکہ اس طرح جنس ایک خاص طبقے سے وابستہ کر دی جاتی تھی، اور اس کی پراگندگی ہم ایسے شریف لوگوں کو نہیں چھو سکتی تھی سلیم اختر نے ایک دو افسانوں کے سوا اپنے کردار شریف طبقے ہی سے چنے ہیں اور اس طرح ہم اپنے بستروں میں اطمینان سے نہیں لیٹ سکتے کہ جنس کا سیلاب دروازے پر لگاتار دستک دیتا ہے اور ماحول کو مرطوب بناتا ہے جنس پر لکھنے والے افسانہ نگاروں میں سلیم اختر ایک بالکل الگ راستے پر چلا ہے اس نے جنس کو صرف اور صرف عورت اور مرد تک محدود نہیں رکھا ہے بلکہ اس کی چادر میں پوری طرح پاؤں پھیلائے ہیں اس کی جہاں دیدہ آنکھیں اس جنس کے روپ پر مرکوز ہوئی ہیں جسے عرف عام میں کجروی کا نام دیا جاتا ہے مثلاً "بجز مرد" اور "زرخیز عورتیں" کی زرخیز سوکنیں جو ایک خاص منصوبے کے تحت ایک ہی خاوند کے بستر میں آلیٹتی ہیں لیزبین ازم کی ایک زرخیز مثال ہے "سیفو ۴۹۶ ق م" (؟) نوعیت کا عمدہ افسانہ ہے "تختۂ مشق" "پابندیٔ وقت کے فوائد" "خبیث دانت" "بارہواں کھلاڑی" "قوت" ہم جنسی سے بھرپور کہانیاں ہیں سلیم اختر نے جنس کا تنگ دائرہ اتنا وسیع کر دیا ہے کہ اس کی زد میں ہر سانس لینے والی شے آجاتی ہے "تجلے پاؤں کی بلی" دبے پاؤں آتی ہے اور بلا بن جاتی ہے "برقعہ پوش لونڈیا" "پردے کے اندر ایک گرم کبوتر ہے جو اڑنا چاہتا ہے" "بکری" تک کے پیدائشی عمل کی زرخیزی کا اندراج صرف سلیم اختر ایسا افسانہ نگار ہی کر سکتا تھا جو کلینکل ریسرچ کا بھی ماہر ہو۔

جنس کے حوالے سے زندگی کی تہوں تک پہنچنے والی تحریروں میں ایک بات ہمیشہ پائی جاتی ہے کہ جس طرح جنس بذات خود ایک میکانکی عمل ہے اسی طرح اس کی تشریح بھی چند میکانکی الفاظ تک محدود ہے چنانچہ جونہی جنسی اشتہا، اعضاء اور عمل کا ذکر آتا ہے تو مخصوص الفاظ منظر عام پر آجاتے ہیں کچھ عرصہ پہلے برطانوی جریدہ "انکاؤنٹر" میں "آن پورنوگرافی" کے نام سے ایک ادبی مضمون شائع ہوا تھا جس کے اختتام پر ان بتیس الفاظ اور تشبیہوں کی فہرست دی گئی تھی جو لامحالہ ہر اس تحریر میں در آتے ہیں جس میں جنس کا عمل دخل ہوتا ہے اس مضمون کے مطالعے کے بعد جب بھی اس نوعیت کی کوئی تحریر پڑھی تو ان محدود الفاظ کی آمد پر وہ مجھے انتہائی مضحکہ خیز لگی ہمارے ادب میں شامل بیشتر ایسی کہانیاں بھی انہی چند الفاظ کی بنیاد پر تعمیر کی گئی ہیں (وہ الفاظ اور تشبیہات یہاں دہرانا بذات خود ایک مضحکہ خیز عمل ہوگا)، البتہ سلیم اختر کا یہ بہت بڑا کمال ہے کہ ایسی صورتحال کے لئے اس کے پاس ایک انتہائی ذاتی قسم کی ٹکسال ہے جس میں وہ ایسے گرم سکے خود ڈھالتا ہے جو نئے نکور سکے کھنکھناتے سکے جو ہم نے اس سے پیشتر کہیں نہیں دیکھے

سلیم اختر کے افسانوں کے عنوان انتہائی چونکا دینے والے اور نادر و عجیب ہیں مگر ان میں بنیادی خوبی یہ ہے کہ وہ کہانی کے محدب شیشے میں سے نکلنے والی تیز ترین شعاعیں ہیں اور ایسی اینٹ ہیں جس کی ساخت دیکھ کر پوری عمارت سامنے آجاتی ہے اس کی تحریروں میں نفسیاتی عوامل کے رچاؤ کو دیکھ کر جی چاہتا ہے کہ کچھ اس طرح ان عنوانات کو اس کی ذات پر منطبق کر کے پرکھا جائے کہ دراصل وہ ہے کیا۔۔۔ یعنی کیا سلیم اختر کانا چور ہے؟ بیوی کا الاؤ ہے؟ سویٹ ہارٹ ہے؟ کھلونا ہے؟ موری کی اینٹ ہے؟ بجز مرد ہے؟ بیویوں کی سازش ہے؟ گریز پا ہے، تختۂ مشق ہے؟ بارہواں کھلاڑی ہے؟ یا شاید بکری ہے؟ لیکن جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے کہ اس نے تو یہ کردار چہرے پر بزرگوں کی سی دانائی سجائے، ہم سب بے چارگی سے بیٹھ کر آنکھیں جھپکتے ہوئے ہم ایسے شریف لوگوں میں سے ہی دریافت کئے ہیں تو کیا یہ ہم سب کے لئے خطرے کا الارم نہیں ہے کیونکہ یہ عنوان سلیم اختر پر نہیں ہم پر منطبق ہونے چاہئیں تھے کس کس پر کونسا عنوان؟ ہمیں یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ ہم میں سے کون کانا چور ہے؟ بیوی کا الاؤ ہے؟ بجز مرد ہے۔۔۔۔۔۔۔!

انعام الحق جاوید

ڈاکٹر سلیم اختر سے گفتگو

زندگی کے ابتدائی ادبی تجربے؟

یوں سمجھیں کہ بچپن سے ہی مجھے کتابیں پڑھنے کا بے حد شوق تھا۔ یہ تو یاد نہیں کہ سب سے پہلے کون سے کھلونے سے کھیلا لیکن یہ ضرور یاد ہے کہ چھوٹی عمر میں ہی "تعلیم و تربیت" اور بچوں کی کہانیاں پڑھنی شروع کر دی تھیں کھیلوں کا شوق بہت ہی کم تھا اور ابھی تک باقاعدگی سے کوئی کھیل نہیں جانتا۔ ابتدا سے ہی تنہائی پسند تھا لہٰذا فرصت کی ساری گھڑیاں پڑھنے میں ہی گذرتیں پڑھتے، پڑھتے ہی ایک روز یہ خواہش پیدا ہوئی کہ مجھے بھی کوئی ایسی چیز لکھنی چاہیئے جسے دوسرے پڑھیں چنانچہ پانچویں جماعت میں اس شوق کی تکمیل یوں ہوئی کہ "ایماندار مصوّر" کے نام سے میری پہلی کہانی بچوں کے رسالے "تعلیم و تربیت" میں چھپ گئی اس کے بعد میں لکھتا رہا رسالے چھاپتے رہے اور خود اعتمادی بڑھتی رہی پونا میں سید عبدالحمید عدم اور میرے والد صاحب کولیگ تھے اور رہتے بھی آمنے سامنے ہی تھے چنانچہ میں نے انہی کے تخلص سے بچوں کی شاعری شروع کر دی اور عدم صاحب سے اصلاح لینے لگا عدم صاحب کی زندگی کا یہ گوشہ شاید ابھی لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ ہو کہ اس زمانے میں وہ عراق سے ملکہ نامی ایک عورت بیاہ کر لائے ہوئے تھے اور اس کے ساتھ رہتے تھے خیر نومبر ۱۹۴۸ء میں ہم لاہور آ گئے۔ اس وقت میں ساتویں جماعت میں تھا۔ آٹھویں میں پہنچا تو میرا پہلا افسانہ قربانی کے نام سے لاہور کے ایک قلمی پرچے میں شائع ہوا۔ دسویں تک پہنچتے پہنچتے شمع دہلی میں چھپنے والی کہانیوں کے علاوہ بچوں کے لئے میری دو کتابیں بھی شائع ہو چکی تھیں اور بچوں میں میرا نام جانا جاتا تھا۔

آپ کی باقاعدہ ادبی زندگی کا آغاز کب ہوا؟

میرا پہلا تنقیدی مضمون جو "ابن الوقت" پر تھا ۱۹۵۴ء میں ناصر کاظمی کے ہمایوں میں چھپا۔ پھر ۱۹۵۹ء میں جب حنیف رامے نے ہفتہ وار "نصرت" نکالا تو میں اس میں نفسیاتی مضامین لکھا کرتا تھا لیکن یوں کہ ڈاک سے مضمون بھجوا دیا کرتا تھا اور وہ شائع کر کے مجھے پرچہ بھجوا دیتے تھے "عورت جنس اور جذبات" کے سارے مضمون اس رسالے میں چھپے ۱۹۶۲ء میں، میں لیکچرر ہو کر ملتان چلا گیا۔ ملتان کا ادبی ماحول اس وقت یبوست زدہ تھا اور صرف ایک عرش صدیقی ہی نئے ذہن کا آدمی نظر آتا تھا۔ مسعود اشعر بھی اس وقت وہیں تھا اور وہ نئے افسانے کا نمائندہ تھا۔ اس وقت وہاں کوئی عورت بغیر پردے کے نظر نہ آتی تھی حتیٰ کہ اسکول اور کالج کی لڑکیاں جن تانگوں میں سوار ہو کر جاتی تھیں ان کے ارد گرد بھی چادر لپٹی ہوتی تھی اور لڑکیوں نے ان چادروں میں پنسلوں سے سوراخ کیے

ہوئے تھے تاکہ آتوں جانوں کو دیکھ سکیں ۔

ڈاکٹر صاحب ! آپ نے اپنی بہت سی تحریروں میں جنسی موضوعات کو بہت اہمیت دی ہے کہ اس کا آپ کی ذات سے کیا تعلق بنتا ہے ؟

بات یہ ہے کہ "عورت جنس اور جذبات" میں ایک آدھ واقعہ کے علاوہ باقی سارے واقعات سچے ہیں ان میں میرے مشاہدات بھی ہیں اور تجربات بھی ۔ لڑکیوں سے میری دوستیاں بھی رہیں اور ملاقاتیں بھی ۔ تاہم ان ملاقاتوں میں رومانس کم اور نفسیاتی تجربہ زیادہ ہوتا تھا ۔ اس کتاب کی اشاعت کے بعد بھی بہت سے لڑکے لڑکیوں نے عملی تحلیل نفسی کے سلسلے میں میری طرف رجوع کیا اور میں نے ان کی مدد کی ۔ اس کے علاوہ خطوط کے ذریعے بھی بہت سے نوجوانوں کے مسائل حل کر چکا ہوں ۔

خیر یہ تو آپ کا ایک ذیلی شعبہ تھا ۔ لیکن ادب میں آپ ایک نفسیاتی نقاد کے طور پر مشہور ہیں جبکہ خود مغرب میں بھی نفسیاتی دبستاں کو کئی سطحوں پر رد کیا جا چکا ہے اس سلسلے میں آپ کا موقف ؟ اور نفسیاتی تنقید سے دلچسپی کی خصوصی وجوہات ؟

پہلی بات تو یہ کہ علمی سطح پر کوئی نظریہ بھی نہ تو پوری طرح قبول کیا جاتا ہے اور نہ ہی رد بلکہ کچھ لوگ ایک پہلو کو اپنا لیتے ہیں اور کچھ اسے رد کر دیتے ہیں حالانکہ صداقت تو کہیں بھی نہیں ہوتی چنانچہ یورپ میں ہی اس نظریے پر اعتراضات ہوتے ۔ کچھ نفسیات کو پوری طرح نہ سمجھنے کی وجہ سے اور کچھ تعصب کے باعث تاہم میں سمجھتا ہوں کہ اردو ادب کو ابھی نفسیاتی تنقید کی ضرورت ہے ۔ کیونکہ چند بزرگوں کو چھوڑ کر ہماری بیشتر تنقید لفظی خوبیوں اور محاسن کے بیان تک محدود ہے تخلیق کے پیچھے اصل محرک کیا تھا ۔ اس پر بہت کم لوگوں نے قلم اٹھایا ہے شاعر شعر کیوں کہتا ہے اور ایک خاص ذہنی حالت میں ایک خاص طرح کی چیزیں کیوں لکھی جاتی ہیں شاعر کی شخصیت تخلیق میں کس طرح در آتی ہے اور نہیں آتی تو کیوں ۔ یہ اور اس قسم کے اور بہت سے سوالات ہیں جن کا جواب صرف نفسیات ہی دے سکتی ہے اور یہی اس کا جواز ہے ۔ مثلاً میر تقی میر باقاعدہ پاگل رہ چکا تھا ۔ ایسا پاگل کہ اس کے منہ سے جھاگ نکلتی تھی اور لوگ اسے پتھر مارا کرتے تھے اس کا اپنا بیان ہے کہ چاند میں اسے محبوبہ نظر آیا کرتی تھی اور وہ بے ہوش ہو جایا کرتا تھا ۔ اس کا علاج کرایا گیا ۔ دوائیں دی گئیں اور تب جا کر وہ ٹھیک ہوا ۔ چنانچہ جب ہمیں میر کے بارے میں یہ باتیں معلوم ہو جاتی ہیں تو اس کی کم دماغی یا بد دماغی کا جواز بھی فراہم ہو جاتا ہے اور اسے سمجھنے کا ایک تناظر بھی ملتا ہے ۔ اس طرح مومن خان مومن نے کوئی درجن بھر عشق کئے اور ہر عشق پر ایک مثنوی لکھی اس روشنی میں جب ہم مومن کی عشقیہ غزلوں کا تجزیہ کرتے ہیں تو ایک نئی صورت حال سامنے آتی ہے اس طرح غالب کی شخصیت میں نرگسیت تھی اور وہ محبوب کے ساتھ برابری کی سطح پر گفتگو کرتا تھا یہ ہم اس کی شخصیت کے نفسیاتی مطالعے کی روشنی میں ہی سمجھ سکتے ہیں ۔ میرا جی ہمارے عہد کا آدمی تھا لیکن اس کے ہاں خاص طرح کی بوالعجبیاں پائی جاتی ہیں چنانچہ جب تک ہم اس کی ذہنی ابنارملٹی کے بارے میں نہ سمجھ لیں اس کے فن کو سمجھنا مشکل ہے تاہم اس کے ساتھ ساتھ نفسیاتی تنقید کی بھی کچھ حدود ہیں بعض لوگ نفسیات سے سنسنی خیزی کا کام بھی لیتے ہیں اور چونکا دینے والی باتیں کرتے ہیں لیکن اگر اپروچ خالص علمی ہو تو بہتر نتائج برآمد ہوتے ہیں ۔

ڈاکٹر صاحب آپ ہمیں یہ بتائیں کہ جب آپ فرائڈ کے نظریات کا مطالعہ کرتے ہیں اور ان سے استفادہ کرتے ہیں تو مذہبی نقطۂ نگاہ سے کیا محسوس کرتے ہیں ؟

بات یہ ہے کہ فرائڈ مذہب کا قائل نہیں تھا لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ نفسیات جاننے سے آدمی لا محالہ غیر مذہبی ہو جاتا ہے ۔ نفسیات بنیادی طور پر ذہنی علاج کی بات کرتی ہے فرائڈ نے لاشعور کا تصور دیا ۔ اس نظریے سے فائدہ اٹھانا چاہیئے ۔ تاہم یہاں اتنا ضرور بتاتا چلوں کہ فرائڈ اپنے نظریات سے الگ اپنی زندگی میں ایک پکا یہودی تھا ۔ ایڈلر بھی پیدائشی طور پر یہودی تھا ۔ بعد میں مذہب

کیتھولک ہوگیا۔ اسی طرح یونگ عیسائی تھا اس کے مخالفین اسے صوفی کہا کرتے تھے بلکہ بہت سی باتوں میں یہ مسلمانوں سے خاصا قریب نظر آتا ہے اور مسلمانوں کی طرح خوابوں کی بشارت پر بھی یقین رکھتا تھا سو جس طرح باقی عام علوم ہیں اس طرح نفسیات بھی ایک علم ہے یہ دعویٰ کبھی نہیں کیا گیا کہ نفسیات مذہب ہے یا مذہب کا متبادل ہے اگر نفسیات ایک مذہب ہوتا تو صرف دہی لوگ اس سے فائدہ اٹھاتے جو اس مذہب کے پیروکار ہوتے حالانکہ پاگلوں کا تو ہوتا ہی نفسیاتی علاج ہے یہ ایک دوا ہے اسپرین کی طرح جو مسلمان کھائے گا تو اس کے سر کا درد بھی دور ہوگا اور اگر کوئی کافر استعمال کرے گا تو اسے بھی افاقہ ہوگا۔

ادبی تنقید میں نقاد کے اپنے نظریے کی ضرورت اور اہمیت کے بارے میں آپ کی رائے ؟

تنقید میں نظریہ تو نہایت ضروری ہے۔ کسی بھی اچھے نقاد کو لیں وہ کسی نہ کسی نظریے کے تابع دکھائی دے گا۔ اگر اس کا اپنا نظریہ نہیں ہے تو وہ کسی نظریے کے رو یا عضر درلگا ہوگا۔ تاہم نظریات کے رد و قبول میں بھی افہام و تفہیم کی فضا ہونی چاہیئے اور یہ کہنا کہ جس نظریے کے تحت میں کام کر رہا ہوں صرف وہی سچائی ہے۔ درست نہیں۔ نقاد میں اتنی لچک تو ہونی چاہیئے کہ اچھی چیز کو اپنا سکے میں نے نفسیات سے کام تو بے شک لیا ہے لیکن زبردستی کہیں نہیں کی آخر جدید علوم سے استفادہ کئے بغیر ہم کیسے آگے بڑھ سکتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب آپ نے اپنی کتاب اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ میں ترقی پسند تحریک کے ضمن میں بھی بہت کچھ لکھا ہے اس سلسلے میں آپ کا ذاتی نظریہ کیا ہے ؟

میں نے اس تحریک کے صرف ادبی پہلو پر بحث کی تھی اور سیاسی پہلو کا ذکر صرف ضمناً آیا تھا ادب میں یہ ایک اہم تحریک تھی جس نے زندگی کو زندگی سے قریب کیا ادب میں آپ کو جتنے بھی بڑے نام ملیں گے وہ کسی نہ کسی حوالے سے یا تو اس تحریک سے وابستہ رہے یا متاثر رہے اگر ہم ان لوگوں کو ادب سے خارج کر دیں تو ادب میں ایک بہت بڑا خلا پیدا ہو جائے گا تاہم ترقی پسند تحریک کے سیاسی نظریات پر پہلے دن سے ہی اعتراض ہوتا رہا اور آج تک ہو رہا ہے ترقی پسند نفسیات کے خلاف ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ اصل مسائل اقتصادی ہیں جبکہ نفسیات ایک آدمی کا علاج تو کرتی ہے۔ لیکن معاشرے سے ان برائیوں کو دور نہیں کرتی جس سے فرد نیوراٹک ہو جاتا ہے۔ اس اعتبار سے میرا نظریہ ترقی پسندوں سے جدا ہو جاتا ہے۔

"انسان پرستی" کے حوالے سے ترقی پسندوں کا جو نقطہ نظر سامنے آیا ہے اسے آپ کہاں تک حسبِ خواہش پاتے ہیں ؟

"کلٹ" تو خیر انتہا پسندی کی بات بن جاتی ہے لیکن جب ہم اس وقت کے ادب کو دیکھتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ غزل میں ایک مجہول قسم کا عشق کارفرما تھا اور بحیثیت مجموعی ادب کے پاؤں زمین سے اوپر اٹھے ہوئے تھے چنانچہ انسان دوستی کا رویہ اس کے ردعمل کے طور پر ابھرا اور جدید افسانے کو تو ارتقاء ملتا ہی اس کے زیر اثر ہے۔ تاہم اس کی سطح ایک سی نہیں ہے۔ منٹو کے افسانوں کا انسان اور طرح کا ہے۔ جبکہ بیدی، عصمت اور ندیم کے ہاں بھی انسان آیا ہے لیکن ان میں سے ہر ایک نے انسان کے مختلف پہلوؤں کو لے کر اس کی عکاسی کی ہے شاعری میں احساس کی شدت زیادہ ہوتی ہے مصرع اگر سپاٹ ہو جائے تو یہ سلوگن بن جاتا ہے اور سلوگن ایک نظریئے کو پوری طرح منعکس نہیں کر سکتا۔ پھر یہ کہ یہاں انسان کے منفی پہلو بھی زیر بحث آئے ہیں اور اس کی کمینگیاں بھی آئی ہیں یعنی انسان سفید اور سیاہ دو رنگوں سے مکمل ہوتا ہے اور اس میں کوئی حرج کی بات بھی نہیں ہے یہ واقعیت نگاری اور حقیقت نگاری کا تقاضا ہے

سماجی حقیقت نگاری سے ہی یہ بات بھی نکلتی ہے کہ کیا یہ ادیب کے فرائض میں شامل ہے کہ وہ انسانی زندگی کے تاریک پہلوؤں کو بھی ادب کا موضوع بنائے ؟

یہ فرض کر لینا کہ ادیب صرف یہی کام کرے یہ تو درست نہیں تاہم ادب میں ایک پر کشش موضوع کے اچھے اور برے دونوں

پہلوؤں کا آنا ضروری ہے آپ دیکھیں کہ منٹو تمام تر فحاشی کے الزامات کے باوجود اور تمام تر کنٹروورسی کے باوصف ابھی تک کیوں زندہ ہے اس نے بڑے کراہت آمیز اور گھناؤنے کردار لئے ہیں لیکن اس کا فن اس گندگی میں بھی کہیں نہ کہیں حسن ضرور دکھا جاتا ہے۔ میرے نزدیک تو ادب لکھنے کے ایک انداز کا نام ہے چھوٹا فنکار زندگی کے اچھے پہلوؤں کو بھی لے گا تو بدصورت بنا دے گا جبکہ ایک بڑا فنکار بری صورت حال سے بھی خوشبو اور خوبصورتی اخذ کر لیتا ہے

ڈاکٹر صاحب آپ یہ بتائیں کہ کیا ایک نقاد کو اپنی رائے بدلنے کا حق دیا جا سکتا ہے ؟

میرا خیال ہے کہ نا قد کو رائے بدلنے کا حق تو ہونا چاہیئے کیونکہ وہ سفر میں ہوتا ہے اور ارتقاء کا سفر اسی طرح مکمل ہوتا ہے۔ مثلاً آپ عسکری صاحب کو ہی دیکھ لیں ایک وقت تھا کہ وہ پھسلن جیسے افسانے لکھتے تھے اور ایک وقت آیا کہ انہوں نے قرآن کی تفسیر لکھنی شروع کر دی اگر آپ دیانت داری سے سوچیں تو یہ ایک ارتقاء ہے لیکن مخالفانہ انداز اپنائیں تو یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ موقف بدل لیا ہے میرا خیال ہے کہ اگر ایک نقاد "اچیز گل محمد" کی طرح ایک ہی جگہ جما رہتا ہے تو وہ فارمولا تنقید کے علاوہ اور کچھ نہیں کہہ سکتا تنقید میں ساری رونق آپ کو تصورات میں تنوع کی وجہ سے ہی ملے گی۔ میں رائے کو ایک آزاد انسان کی تخلیقی فعلیت کے مترادف گردانتا ہوں اور اس کے آزادانہ استعمال کو جمہوریت کے حق کے لئے ضروری سمجھتا ہوں اس لئے ہر بالغ نظر نقاد کو بڑھتے ہوئے مطالعہ اور زندگی کے بدلتے پیٹرن کے مطابق رائے تبدیل کر سکتا ہے البتہ رائے کی وہ تبدیلی قابل مذمت ہے جس میں نقاد "ہزماسٹرز وائس" یا اپنے آقائے ولی نعمت کا پالتو نقاد بن کر رہ جاتا ہے ادھر معتبر آقا کی آنکھ میں بال آیا ادھر انہوں نے بھی کھٹ سے گالیوں کا پٹارہ کھول دیا۔ اور پھر وہ بھی ہیں جو روپیہ پیسہ لیتے ہیں اور اپنی انٹیگریٹی کے دام وصول کرتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب ابھی کچھ دیر پہلے آپ نے وزیر آغا کا ذکر کیا۔ تو میں یہ پوچھنا چاہوں گا کہ کیا آپ کو ان کی کتاب اردو شاعری کا مزاج کے مندرجات سے اتفاق ہے ؟

بات یہ ہے کہ میں ہمیشہ غیر جانبدار ہو کر لکھتا ہوں کبھی "اردو شاعری کا مزاج" بھی مجھے پسند تھی اس میں ڈاکٹر صاحب نے ایک نئے نقطہ نظر کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے لیکن اس میں قباحت یہ ہے کہ یوں لگتا ہے جیسے نظریہ تو بہت بڑا ہے لیکن اس کی عملی تطبیق کرتے وقت وہ ٹھوکریں کھا گئے ہیں کیونکہ اگر ان کا دھرتی پوجا والا فلسفہ پوری طرح مان لیا جائے تو پھر پاکستانیوں کو دراوڑی بننا پڑتا ہے اور پتہ نہیں چلتا کہ ہماری تہذیب کہاں سے شروع ہوتی ہے قیام پاکستان سے محمد بن قاسم سے یا اس وقت سے جب آریا یہاں آئے تھے۔ سو میرا خیال ہے کہ پاکستان بننے کے بعد اس طرح کے موضوعات پر لکھنے کے لئے مناسب مطالعہ کے ساتھ ساتھ بہت محتاط ہونے کی ضرورت ہے ادھر جب سے رشید ملک نے اس میں سے سرقہ کی مثالیں پیش کی ہیں یہ کتاب بالکل بے معنی لگنے لگی ہے۔

ڈاکٹر صاحب ! ہمارے ہاں گذشتہ ایک عرصے سے "پاکستانی ادب" کی جو تحریک چلی ہوئی ہے اس بارے میں آپ کا کیا موقف ہے ؟

دراصل پاکستانی یا قومی ادب کی بحث تو ۱۹۴۷ء سے ہی شروع ہو گئی تھی اور جو جذبہ اس وقت کام کر رہا تھا وہی اب بھی ہے یعنی بحیثیت قوم ہمارا ایک الگ تشخص ہے اور ادب ایسا ہونا چاہیئے جو ہمارے اس تشخص کا آئینہ دار ہو لیکن عملاً جب ہم اپنے ادب کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ بھی سوچنا پڑتا ہے کہ اس میں کون کون سے نظریات شامل ہونے چاہئیں اور کن کن باتوں سے اجتناب کرنا چاہیئے ہمارے ہاں مختلف قسم کے فکری رجحانات کام کر رہے ہیں اب یہ کیسے طے ہو کہ صرف یہ رجحان ہی پاکستانی ہے پھر مختلف حکومتوں کے زیر اثر مختلف طرح کے خیالات کا پرچار ہوتا رہتا ہے جو بات ایک عہد حکومت میں اچھی ہوتی ہے دوسرے دور حکومت میں وہی اچھی نہیں ہوتی اور پھر "پاکستانی ادب" کہہ دینا تو آسان ہے اس کا قطعی جواب دینا آسان نہیں ہے اس سلسلے میں بہت سے چھوٹے چھوٹے ضمنی سوالات بھی

ابھرتے ہیں۔ بہرحال اتنا طے ہے کہ اگر کوئی تحریر قومی نقطۂ نظر سے لکھی جائے اور اس میں ہمارے کلچر کی مخصوص جھلک کے ساتھ ساتھ مذہبی رنگ بھی موجود ہو تو وہ پاکستانی ادب ہے تاہم اگر اسے "پاکستان کا ادب" کہہ لیا جائے تو اس میں زیادہ تخصیص ہو جاتی ہے۔

اسی سلسلے میں ایک اور سوال کہ کیا ہندوستان میں تخلیق ہونے والے اردو ادب اور پاکستان میں جنم لینے والی تخلیقات میں کسی واضح فرق کی نشاندہی کی جا سکتی ہے؟

یہاں یہ مثال ہی کافی ہوگی کہ مجھے ہندوستان جانے والے کئی دوستوں نے آ کر بتایا ہے کہ جب وہ دلی سے گذر رہے تھے تو ایک شخص نے انہیں روکا اور پوچھا کہ کیا آپ پاکستانی ہیں سوجب ہمارا ایک عام آدمی اتنے بڑے ہجوم میں بھی اپنے قد یا عوامی سوٹ سے پہچانا جاتا ہے تو ادب میں یہ شناخت کیوں ممکن نہیں۔ میں نے وہاں کی نئی شاعری تو زیادہ نہیں پڑھی لیکن تنقید اور افسانہ ضرور پڑھا ہے اور اس سلسلے میں میری رائے یہ ہے کہ جدید افسانہ یہاں سے وہاں گیا ہے بھارت سے جب شمس الرحمان فاروقی یہاں آئے تھے تو انہوں نے بھی اس بات کا اعتراف کیا تھا

لیکن گذشتہ دنوں آل انڈیا ریڈیو سے گفتگو کرتے ہوئے انہی صاحب نے اس کے بالکل الٹ بات کی تھی اور کہا تھا کہ شاعری تو پاکستان میں اچھی ہو رہی ہے لیکن افسانہ ہندوستان میں بہتر لکھا جا رہا ہے؟

پھر وہاں جا کر انہوں نے اپنا بیان بدل لیا ہوگا تاہم میں یہ سمجھتا ہوں کہ ان کے مقابلے میں ہمارے ہاں کے جدید افسانے میں گہرائی زیادہ ہے اور تجربے بھی یہیں زیادہ ہوئے ہیں۔ اس طرح تنقید میں بھی ہمارے ہاں بہتر کام ہو رہا ہے آپ نے ابھی یہاں کے اور وہاں کے ادب میں فرق کے بارے میں پوچھا تو آپ دیکھیں کہ یہ فرق تنقید کی سطح پر بھی خاصا نمایاں ہے کہ ہمارے نزدیک اقبال کا وہ پہلو زیادہ اہم ہے جس میں انہوں نے نظریہ پاکستان کی بات کی ہے جبکہ ہندوستان میں ان کے اس پہلو کو لیا جائے گا جس میں وہ کہتے ہیں کہ

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

اس طرح اقبال کے بارے میں فراق گورکھپوری کا رویہ بھی سب کے سامنے ہے جس نے سال اقبال میں علامہ کے خلاف ایک معاندانہ مضمون لکھا۔ وہ غالب پر تنقید کرتے ہیں تو ع ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم۔ والے پہلو کو زیادہ اجاگر کرتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب! علامتی اور تجریدی افسانے کے حال اور مستقبل کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

بات یہ ہے کہ اگر ہم افسانے کے تدریجی ارتقاء کا مطالعہ کریں تو صاف پتہ چلتا ہے کہ ہمارے ہاں علامتی افسانہ ۱۹۶۰ء کے قریب قریب ادب میں داخل ہوا اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ علامتی افسانہ نگاروں کے خیال میں حقیقت نگاری کی روایت میں کہانی کہنے کے سارے امکانات قریباً قریباً بروئے کار لائے جا چکے تھے اور نئے لکھنے والوں کو کوئی نیا اسلوب درکار تھا اس کی دوسری وجہ غالباً پابندی کی فضا سے متعلق ہے ایوب خان کا دور شروع ہو چکا تھا اور لکھنے والا صاف کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا لہٰذا اس پابندی سے ایک نئی ضرورت نے جنم لیا اور علامتی افسانہ معرض وجود میں آیا رہی بات تجریدی افسانے کی تو اس میں مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے لکھنے والا وقت کی اکائیاں توڑ دیتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے فلم کے ٹریلر میں مختلف سین ہوتے ہیں۔ کوئی کہیں کا اور کوئی کہیں کا اسے دیکھ کر آپ فلم کے بارے میں کچھ تھوڑا بہت غلط یا صحیح اندازہ تو لگا سکتے ہیں لیکن فلم سمجھ نہیں سکتے پھر یہ بھی ہے کہ جو شخص زیادہ فلمیں دیکھنے کا عادی ہوتا ہے وہ زیادہ جلدی سمجھ جاتا ہے لیکن عام آدمی کے لئے یہ ٹریلر فلم کی کنجی نہیں بن سکتا۔ ادھر ہمارے مزاج کی وابستگی بھی حقیقت پسند افسانے سے ہے۔ وہ منطقی ہو یا غیر منطقی ہمیں زیادہ بہتر لگتا ہے تاہم تجریدی یا علامتی افسانے

کے مستقبل کے بارے میں ابھی سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ بیشتر لوگ تو اس لئے بھی لکھ رہے ہیں کہ مستقبل کا نقاد خواہ ان کی برائی کرے خواہ تعریف ان کا نام لینے پر تو مجبور رہے گا۔

اسی طرح اگر ہم گذشتہ ۱۵۔ بیس برسوں کی ادبی تاریخ کا مطالعہ کریں تو اس عرصے میں ہمیں نثری نظم اور انشائیے جیسی نئی اصناف کا ذکر بہت ملتا ہے کیا آپ اس سلسلے میں اپنی رائے ریکارڈ کرانا پسند کریں گے ؟

نثری نظم میں پھیلا تو اس کی اصطلاح کی وجہ ہے کہ یہ نثر کے ساتھ نظم اور نظم کے ساتھ نثر ہے عوام میں یہ اس لئے مقبول نہیں کہ لوگ ردم چاہتے ہیں وہ لوگ جنہوں نے آزاد نظم کو ہی بڑی مشکل سے ہی قبول کیا ہے اس طرف کیسے آ سکتے ہیں آزاد نظم میں تو پھر بھی ایک ردم ہوتا ہے یہاں وہ بھی نہیں ہے اسی طرح انشائیے کی عدم مقبولیت کی بھی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اس میں لایعنیت میں یعنیت اور بے معنویت میں معنویت پیدا کرنے پر زور دیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ جو انشائیہ وزیر آغا کے رنگ میں لکھا جائے گا وہی صحیح انشائیہ ہوگا چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اوراق میں چھپنے کے لئے بہت سے لوگ اس رنگ میں لکھتے ہیں اس کے ساتھ ساتھ نواہی کی ایک فہرست بھی بنا دی گئی ہے۔ جس کے نتیجے میں انشائیہ محض وزیر آغا کے پلپلے اسلوب میں لکھی ہوئی ایک پھسپھسی سی تحریر بن کر رہ جاتی ہے تاہم جن لوگوں مثلاً مشکور حسین یاد نے اس اسلوب سے ہٹ کر لکھا ہے انہوں نے بڑے اچھے اچھے انشائیے تخلیق کیے ان میں طنز بھی ہے اور مزاح بھی شگفتگی بھی ہے اور توانائی بھی۔ بہرحال انشائیہ آج کی صنف نہیں ہے بلکہ غالب کے بعض خطوں پر بھی انشائیے کا گمان ہوتا ہے اس کے علاوہ سجاد حیدر یلدرم۔ مہدی افادی اور نیاز انصاری نے بھی انشائیے لکھے مولانا محمد حسین آزاد کے مکاتیب کے مجموعے مکتوبات آزاد کے صفحہ ۱۰۲ پر انشائیے کا لفظ اور اس کی تشریح موجود ہے سب سے پہلا انشائیہ بھی محمد حسین آزاد نے ہی لکھا اس کے علاوہ ۱۹۴۴ء میں سید علی اکبر قاصد کے انشائیوں کا ایک مجموعہ "ترنگ" پٹنہ سے شائع ہوا۔ جس کے دیباچے میں اختر اورینوی کے یہ الفاظ درج ہیں " اردو ادب میں انشائیوں اور خاکوں کی بڑی کمی ہے کبھی کبھی کوئی اچھا سا انشائیہ پرچوں میں نکل آتا ہے۔ تو دو گھڑی جی بہل جاتا ہے۔" اب ان حالات میں ڈاکٹر وزیر آغا کو اس صنف یا اصطلاح کا موجد کیسے مانا جا سکتا ہے اگر انشائیہ نگار واقعی اس صنف کو ترقی دینا چاہتے ہیں۔ تو انہیں اسے ڈاکٹر وزیر آغا کے کنوئیں کا پالتو مینڈک بننے سے بچانا ہوگا۔

ڈاکٹر صاحب ! آپ نے سفرنامہ پر ایک بہت دلچسپ مضمون قلمبند کیا تھا۔ یہ ان دنوں سفرنامہ ایک دم کیسے بے حد مقبول ہو گیا ہے ؟

پہلی بات تو اس ضمن میں یہ عرض کر دوں کہ سفرنامہ کوئی آج کی چیز نہیں جبکہ اردو میں اس کی عمر صدی سے اوپر بنتی ہے۔ یوسف کمبل پوش کے سفرنامہ کو بالعموم پہلا سفرنامہ قرار دیا جاتا ہے اس کے بعد سرسید احمد خان مولانا شبلی اور دیگر بزرگ آتے ہیں ان سب حضرات نے سفرنامہ کو معلومات کا ذخیرہ اور کوائف کا پلندہ بنانے کی کوشش کی چنانچہ ان سفرناموں میں جغرافیائی تاریخی اور تہذیبی معلومات پر زیادہ زور دیا جاتا تھا تاریخی عمارتوں کی پیمائش تک بڑے التزام سے درج کی جاتی تھی اگرچہ یہ سب بھی بے حد دلچسپ تھا اور غالباً اس وقت کے لوگوں کو ایسی ہی معلومات کی ضرورت بھی تھی لیکن اب سفر کی سہولتوں فلم ٹی وی اور دستاویزی فلموں کی موجودگی میں ان سفرناموں میں حرا نہیں رہا۔ کیونکہ یہ معلومات تو اب باآسانی سفری کتابچوں کے ہاں ملنے والے بروشروں سے ہی مل جاتی ہیں جدید سفرنامہ نگاروں نے اس ضمن میں یہ انقلابی تبدیلی پیدا کی کہ انہوں نے تاریخی عمارات اور تہذیبی آثار سے ہٹ کر افراد کو فوکس میں لینے کی کوشش کی اور یوں سفرنامہ زندگی سے زیادہ قریب ہو گیا۔ بیگم اختر ریاض الدین سے لے کر عطاء الحق قاسمی تک جدید سفرناموں میں دلکشی ان افراد سے پیدا ہوتی ہے جن سے وہ ہمیں ملواتے ہیں پھر اس

میں بھی لکھنے والوں کا اپنا اپنا انداز ہوتا ہے مثلاً عطاء الحق قاسمی نے جرمنی کے سفرنامہ میں بھی جن جرمن لوگوں سے ملوایا وہ ایک طرف اپنی انفرادی حیثیت رکھتے ہیں تو دوسری طرف بعض امتیازی خصوصیات کی بنا پر جرمن سائیکی کے مظہر بھی بن جاتے ہیں، اسی طرح ابن انشاء ہیں جنہوں نے اپنے پرلطف اسلوب سے شہروں کو گویا زندہ افراد میں تبدیل کر دیا یوں کہ ان کی گلی ہی ان کی شناخت بن جاتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب! ابھی آپ نے بتایا تھا کہ آپ نے بہت کم عمری میں افسانے لکھنے شروع کر دیئے تھے تو کیا وجہ ہے کہ ابھی تک آپ کے افسانوں کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا؟

انعام صاحب! یہ درست ہے کہ میں نے افسانے کم عمری میں لکھنے شروع کر دیئے تھے ۱۹۵۱ء میں جب میٹرک کا طالب علم تھا شمع دہلی میں میرے دو افسانے "ایک محبوبہ ایک طوائف" اور "کٹھ پتلی" شائع ہوئے تھے مگر میں پوری دیانت داری سے یہ اعتراف کرتا ہوں کہ تنقید کے مقابلہ میں افسانہ لکھنا کہیں زیادہ مشکل ہے کسی نے کہا تھا کہ افسانہ لکھنا پسلی میں سے حوا نکالنے والی بات ہے تو صاحب! میں ڈیڑھ پسلی کا آدمی ہوں اس لئے ہر ماہ یا مہینے میں دو پسلیوں میں سے حوا نکالنے کی توفیق مجھ میں نہیں بس سال میں ایک یا دو سے زیادہ افسانے نہیں لکھتا۔ اور جو لکھتا ہوں تو انہیں بھی مختصر بلکہ مختصر ترین رکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ بس اختصار اور مقدار میں کم ہونے کی وجہ سے کتاب کی طرف دھیان ہی نہ گیا۔ ویسے میرا ایک ناولٹ "ضبط کی دیوار" شائع ہو کر بے حد پسند کیا گیا۔

پہلے آپ جنسی اور نفسیاتی کہانیاں لکھتے تھے ان دنوں آپ علامتی کہانیاں لکھ رہے ہیں۔ میں نے حلقہ ارباب ذوق میں پڑھی گئی آپ کی دو کہانیوں "کھجوروں کا موسم" اور "پانچویں گھونٹ" کا بہت چرچا سنا ہے۔ آپ کی یہ علامتی کہانیاں تو سمجھ میں آجاتی ہیں؟

حضرت: آپ سے یہ کس نے کہہ دیا کہ علامتی کہانیاں سمجھ میں نہیں آتیں یا یہ کہ سمجھ میں نہ آنے والی کہانی علامتی ہی ہوگی۔ علامتی کہانی لکھنے والوں کو دو بنیادی باتوں کا خاص طور پر خیال رکھنا پڑتا ہے ایک علامت سازی اور دوسرے اس علامت سے وابستہ متنوع جہات کو اجاگر کرنے کے لئے ہم رنگ اسلوب۔ ان دونوں میں اگر کوئی تضاد نہ ہو اور دونوں ہم رنگ ہو کر یک رنگ ہو جائیں تو کہانی میں معانی کے نئے در وا ہو جاتے ہیں باقی اگر یہ بات کریں علامتی کہانی تک کیسے پہنچا؟ تو عرض ہے کہ میں نے افسانہ نگاری کی ابتداء اسی روایت میں کی تھی جسے حقیقت نگاری کہا جاتا ہے اور میری ذہنی تربیت بھی انہی کہانیوں سے ہوئی تھی لیکن میں سمجھتا ہوں کہ لکھنے والے کو نئے تجربات کی صورت میں ہمیشہ نئی منزلیں سامنے رکھنی چاہئیں ادھر ناگفتنی باتوں کے اظہار کے لئے بھی علامتی اسلوب مجھے زیادہ موزوں نظر آیا لہٰذا میں نے بھی یہ انداز اپنایا اور اب گذشتہ چار پانچ برسوں میں میں نے زیادہ تر علامتی افسانے ہی لکھے ہیں۔

میں نے بعض جرائد میں آپ کے طنزیہ اور مزاحیہ مضامین بھی دیکھے ہیں جبکہ "کلام نرم و نازک" کے نام سے آپ کی ایک کتاب بھی چھپ چکی ہے۔ خشک تنقید، علامتی افسانے اور اب طنز و مزاح۔ تو لگے ہاتھوں انشائیہ بھی لکھ ڈالئے۔

سلام درم! انشائیہ لکھنا کوئی ایسا مشکل کام نہیں ہے لیکن ان دنوں عالم کچھ یوں ہے کہ ہر گرا ادیب انشائیہ نگار بن بیٹھا ہے اس لئے مجھے ایسی بے معنی تحریر میں کسی طرح کی بھی کشش نظر نہیں آتی۔ آگے بس انشائیہ کا کاغذی تاج پہننے والوں کی کمی نہیں میں ان میں شامل نہیں ہونا چاہتا۔ رہی طنز و مزاح والی بات تو میں نے معاشرہ کی کچھ باتوں کچھ رجحانات اور کچھ کرداروں کو ناپسند

کیا۔ اور یوں طنز سے ان کی دورخی اور دو عملی کا پردہ چاک کرنے کی کوشش کی اس ضمن میں۔ میں نے خاص طریقِ کار یہ اپنایا کہ منفی کے حوالے سے اثبات کا استحکام کیا یعنی ساری دنیا کہتی ہے کہ سچ بولو تو یہ یہ فوائد حاصل ہوں گے جبکہ میں کہتا ہوں کہ جھوٹ بولو تو یہ یہ فوائد حاصل ہوں گے۔ جبکہ یہ فوائد درحقیقت نقصانات ہیں۔ "کلام نرم و نازک" کے بیشتر مضامین اسی طرز میں لکھے گئے تھے۔

ڈاکٹر صاحب! آپ نے اقبالیات کے سلسلہ میں بھی بہت کام کیا ہے کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اپنی تحریروں سے آپ نے کوئی قابلِ ذکر کنٹری بیوشن کی ہے؟

میں اپنی تحریروں کے بارے میں خود کیا دعویٰ کروں کہ تعلی کبھی بھی میرے مزاج میں نہ تھی تاہم اتنا عرض کروں کہ "اقبال ممدوحِ عالم" اور "اقبالیات کے نقوش" دو ایسی کتابیں ہیں جن سے ہمارے اقبال شناسوں کو مخصوص مدد مل سکتی ہے۔ اقبال ممدوحِ عالم میں۔ میں نے اسلامی ممالک کے ساتھ ساتھ امریکہ روس، یورپ اور افریقہ کے کوئی پچیس تیس ممالک کے دانشوروں اور نقادوں کے ایسے مقالات جمع کئے ہیں جن میں انہوں نے دل کھول کر اور بھرپور انداز میں علامہ اقبال کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ بظاہر یہ کتاب مرتبہ ہے لیکن اس کے لئے مجھے طبع زاد کام کے مقابلے میں کہیں زیادہ محنت کرنی پڑی۔ جس کا آپ خود اس ایک مثال سے اندازہ لگا سکتے ہیں۔ میں نے ایک پرانی تحریر میں سر ہربرٹ ریڈ کے ایک ایسے مقالہ کا حوالہ دیکھا جو اس نے علامہ پر قلم بند کیا تھا۔ میں یہاں کے بیشتر نامور اقبال شناسوں سے ملا مگر سب نے لاعلمی ظاہر کی۔ تب میں نے لائبریری آف کانگریس کو واشنگٹن میں خط لکھا اور انھوں نے مجھے اس کی نقل بھیج دی یوں میں سمجھتا ہوں کہ میں نے اگر اور کچھ بھی نہیں کیا ہوتا تو صرف ہربرٹ ریڈ کے اس مقالہ کو اردو دنیا کے سامنے لے آنا ہی کافی ہے۔ یہ مقالہ اس نے اسرارِ خودی کے انگریزی ترجمہ پر ۱۹۲۱ء میں لکھا تھا اس کا اردو ترجمہ میں نے "اقبال ممدوحِ عالم" میں شامل کیا ہے۔ "اقبالیات کے نقوش" میں ایسے مقالات جمع کر دیئے گئے ہیں جو علامہ کی زندگی میں لکھے گئے ان مقالات کے مطالعہ سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ علامہ کی زندگی ہی میں ان کے فکر و فن پر لکھنے کا آغاز ہو چکا تھا

ڈاکٹر صاحب! ادب میں شہرت کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

بہت بڑا خیال ہے! میں نے تاریخِ ادب کے مطالعہ سے اور کچھ سیکھا ہو یا نہ ہو لیکن یہ اخلاقی سبق ضرور ملا کہ ادب میں دائمی شہرت صرف چند تخلیق کاروں ہی کو حاصل ہوتی ہے کہیں زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں صرف پاکستان کے عہد کو لے لیجئے آج سے تیس برس جن کے ڈنکے بجتے تھے آج وہ کہاں ہیں آج جن کے ڈھنڈورچیوں کے غل غپاڑے سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی ہو سکتا ہے کل کو ان کا انجام بے حد عبرت ناک ہو۔ بیشتر لکھنے والوں کے لئے شہرت محض سراب ثابت ہوتی ہے اپنے ارد گرد نظر دوڑائیے تو زندوں میں آپ کو کئی مردہ ادیب نظر آئیں گے ادیب اور بالخصوص نیا لکھنے والا یہ حقیقت فراموش کر دیتا ہے کہ پبلسٹی اور شہرت میں زمین و آسمان کا فرق ہے پبلسٹی دوستوں روپے پیسہ اور تعلقاتِ عامہ سے حاصل ہو سکتی ہے لیکن شہرت دائمی قدر ہے اور یہ صرف اور صرف تخلیقات ہی سے حاصل ہو سکتی ہے۔ ایسی تخلیقات جن میں زمانہ کے تھپیڑے سہنے کی سکت موجود ہو اسی لئے تو میر غالب اور اقبال صدی صدی کے بعد ملتے ہیں۔